جلد ۲۷ شمارہ ۴

جولائی ۴۸ء

ادبِ لطیف

لاہور

مدیران:-

چودھری برکت علی

ممتاز مفتی

عبدالمتین عارف

زرِ سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ بارہ آنے

ترتیب

ادارہ

اشارات

فکر و گفتار کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس کا احترام ہر حکومت پہ لازم ہے۔ کوئی معزز خود دار اور باحمیت شہری اس حق پر جارحانہ حملہ برداشت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ اس کے سینے میں اُبلتے ہوئے جذبۂ انسانیت کی توہین ہے۔

شخصی آزادی کے حق میں آواز اٹھانا ملکی غداری کی حمایت کرنا نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو صداقت اور انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ ہم اب آزاد ریاست کے آزاد شہری ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے برتاؤ کرتے وقت ہماری اس حیثیت کا لحاظ رکھنا ہماری حکومت کا فرض ہے۔ جس کی عدم ادائیگی ہمیں مجبور کردے گی۔ کہ ہم اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔

ترقی پسند مصنفین تقریر و تحریر کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار رہے ہیں۔ گذشتہ مہینوں میں پاکستان کے ترقی پسند ادبا نے اس سلسلہ میں کافی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ مغربی پنجاب کی انجمنیں بالخصوص زندگی اور تحرک کا ثبوت دیتی رہیں۔ لاہور، سیالکوٹ، منٹگمری وغیرہ میں متعدد جلسوں اور مشاعروں کے ذریعہ ہمارے لکھنے والے رجعت پرست طاقتوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ لاہور کے ادیب تو مزدوروں کے جلسوں اور ان کی بستیوں میں بھی جاکر خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں ہمیں اپنے رفیقوں کے ان کارناموں پر فخر ہے۔ لیکن ہماری جدوجہد یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ فاشزم، جبر، تعدی، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کیلئے نئے نئے طریقے ایجاد کر رہا ہے۔ ہمیں اُن کا پورے طور سے جائزہ لینا ہے۔ اُن کا قلع قمع کرنے کے طریقوں پر غور کرنا ہے اور اس وقت تک سرگرم عمل رہنا ہے۔ جب تک انہیں جڑ سے اکھیڑ نہیں دیا جاتا۔

مقامِ مسرت ہے کہ ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین بھی اس عوامی جدوجہد میں

پورے طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ پچھلے ماہ بمبئی کے ادیبوں نے ایک عظیم اجتماع میں اپنے عزائم کا پوری شدت سے مظاہرہ کیا۔ اس اجتماع میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور ملک راج آنند جیسے سرپرآوردہ لکھنے والے شامل تھے۔ کرشن چندر نے اس اجلاس میں ایک تجویز پیش کی۔ اس تجویز کا وہ حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ جس میں ملک کے ادیبوں شاعروں، فنکاروں، اور اخبار نویسوں کو یوں مخاطب کیا گیا ہے:۔

"یہ جلسہ آپ کو آواز دیتا ہے کہ آپ وقت کی نزاکت کو محسوس کریں۔ اپنے ادب اور آرٹ کی گونج سے ملک کے کونے کونے کو جگا دیں۔ آپ نے عوام کے دکھ سکھ کو اپنایا ہے۔ ان کی آواز میں آواز ملائی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ آپ اپنی مدد کے لئے عوام کو پکاریں تاکہ اس بات کی آزادی حاصل کی جائے کہ ادیب، فنکار، اخبار نویس اور مقرر جس نظام سے نفرت یا محبت کرتا ہے اس کا بھرپور اظہار کر سکے"۔ تجویز کے آخری الفاظ تھے۔ "ہم سب کا ایک نعرہ ہونا چاہئے۔ آزادی تحریر و تقریر پر حملہ جمہوریت کی موت ہے۔ ہم اس ملک میں فاشزم کی کوئی علامت برداشت نہیں کریں گے"۔

پچھلے مہینے ہم نے اکتوبر میں افسانہ نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ بعض رفیق اس سلسلہ میں تعاون کا وعدہ فرما چکے ہیں۔ ہم ان کے شکر گذار ہیں اور دیگر دوستوں سے معاونت کی توقع رکھتے ہیں۔ امید ہے۔ وہ ہماری اس توقع کو جلد از جلد پورا کریں گے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان تعمیری امور کی طرف اپنی توجہ منعطف کر چکی ہے اور کراچی سے انجمن نے ایک ہفتہ وار پرچہ "قومی زبان" بھی نکالنا شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی زیر نگرانی یہ انجمن زبان کے سلسلہ میں حسب سابق ملک و قوم کی اہم خدمات سرانجام دیتی رہے گی۔

آخر میں ہمیں حکومت پاکستان کی توجہ اس فیصلہ کی طرف مبذول کروانی ہے۔ جس کی رو سے پاکستان سے باہر بھیجی جانے والی کتابوں پر پوسٹیج آٹھ آنے فی سیر (پاکستان کا گذشتہ اور ہندوستان کا موجودہ نرخ) سے بڑھا کر ایک روپیہ فی سیر کر دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت کا یہ اقدام اردو کے لئے نہایت مضرت رساں ہے۔ کیونکہ اس سے اردو کی کتابوں کی دیگر ممالک، بالخصوص ہندوستان میں ترویج و اشاعت رک رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت پاکستان کتابی پوسٹیج کی پرانی شرح کو بحال کر کے اردو دوستی کا ثبوت بہم پہنچائے گی۔

علی سردار جعفری

غزل

تری ادائیں ہیں کافرانہ، نہ تیرے انداز دلبرانہ
تو ہی بتا دے کہاں سے آئیں گے مجھکو آدابِ عاشقانہ

حقیر ہو کر نہ رہ سکے گی تری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدوں سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آستانہ

مرے لئے ایک سے ہیں دونوں، وہ کوئی صیاد ہو کہ گلچیں
نظامِ گلشن میں شاخِ گل سے الگ نہیں شاخِ آشیانہ

فریب دے کر حیاتِ نَو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ!

خلیق بھی ہے شفیق بھی ہے، کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیرِ مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

کوئی بتاؤ یہ کیسی محفل ہے، کیسے مے کش ہیں، کیسے ساقی،
کہ خونِ انسانیت کی بُو سے مہک رہا ہے شراب خانہ

سرور بھر دوں کہاں سے نغموں میں ساز ہی درد آشنا ہے
مجھے بھی خود سے یہی گلہ ہے غزل نہیں میری عاشقانہ

جاوید منظر

لینن اور دُنیائے کلچر

"لینن ــــ اور کلچر" ــــ یہ شروع ہی سے بہت اہم موضوع رہا ہے۔ جس پر مختلف زاویوں سے بہت وسیع و بسیط مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ سرگرم بحثیں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نہ تو میں کوئی بحث و مباحثہ چھیڑوں گا اور نہ ہی اپنی کوئی رائے پیش کروں گا۔ بلکہ اس موضوع پر مختصر پیرائے میں خود لینن ہی کے خیالات سے روشناس کراؤں گا۔

"سُرخ روس" کا بانی کسی طرح بھی روحانی اور کلچرل ترقی کے دائرے سے علیحدہ نہیں رہا۔ اُن کا کہنا ہے۔ کہ "نیا کلچر" تعمیر کرنے کے لئے ہم کو پرانی تہذیب و تمدن سے اچھی اور مفید باتوں کو چُن کر اپنانا چاہیئے۔ اس نے دنیا کے نوجوانوں کو دعوت دی کہ وہ انسانیت کے قائم کردہ مفید نظریات کو اپنے اندر جذب کریں اور یہی ان کی آئندہ ترقی کی سنگِ بنیاد ہوگی۔

سویٹ کو عوام کو اپنی کلچرل کمی پر قابو پانے کے لئے کافی محنت کرنی پڑی اور اسی نکتہ نظر کے ماتحت لینن نے عوام سے جہالت دور کرنے کی خاص جد و جہد کی۔ تعلیم ہی ساری چیزوں کی جڑ بنیاد ہے۔ بغیر صحیح تعلیم کے کسی بھی ترقی کی طرف قدم اٹھانا ناممکن ہے۔ لینن نے کہا ــــ

روسی عوام کو لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے تاکہ ہم اپنے کلچر کو ترقی دے سکیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں تاکہ وہ اپنے کاموں میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ روسی عوام اپنی ترقی کے لئے جس قدر بے چین ہیں۔ دُنیا کا کوئی دوسرا ملک نہیں ــــ

ذاٹکن (ZATKIN) کے پاس آرٹ کے متعلق لینن کے نظریات پر بہت اچھا ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ بجید ذہین تھی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر ہو بہو لینن کے الفاظ تک اپنی ڈائری میں لکھ لیتی تھی۔ اسی لئے کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں ذاٹکن کے نوٹ سب سے زیادہ مستند ہیں۔ آرٹ کے متعلق وہ لینن ہی کے الفاظ یوں نقل کرتی ہے۔

> "فن عوام کی ملکیت ہے۔ اس کی مضبوط جڑیں عوام کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہونی چاہئیں۔ فن کا مقصد متحدہ طور پر عوام کے جذبات، احساسات، اور خیالات کو بیدار کرنا ہے۔ ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ اگر فن اپنے ان فرائض کو انجام نہیں دیتا تو نہ تو وہ فن کہلانے کا مستحق ہے اور نہ اس کا خالق فن کار۔"

فنِ موسیقی ــــ کے متعلق لینن کے نظریات جاننے کے لئے ہمیں اُس کے فن کے "انسانی نقطۂ نظر" کو نہ بھولنا چاہئے۔ جیسا کہ گورکی نے کہا ہے :-

"ایک شام لینن ماسکو میں کیتھرین کے مکان پر بیتھاون (BEETHOVEN) کے نغمے سن رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ میں نے اس سے بہتر نغمے نہیں سنے۔ کاش میں ہمیشہ ہی سُن سکتا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ انسان بھی کیسے کیسے عجیب و غریب کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے ایک دوست نیڈازڈا (NEDAZDA) سے (جو کہ خود بھی ایک اچھا موسیقار تھا) اکثر بیتھاوین کے ہی نغموں کی فرمائش کرتا۔"

جس زمانہ میں لینن پیرس میں مقیم تھا۔ وہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی تماشہ گاہوں میں جاتا جہاں تماشہ کرنے والے اپنے ناچ گانوں میں سماج اور سوسائٹی کی غلط کاریوں پر خوبصورت پیرائے میں پھبتیاں کستے۔ جہاں وہ وقت اور ماحول کے اہم تقاضوں کو بھی اپنے تماشوں میں پیش کرتے۔ وہ مانٹاگس سے "سلام ایسے سترھویں کے سپاہیو" کا گیت سننے کا بہت دلدادہ تھا۔ یہ ان سپاہیوں، ملک اور قوم کے بہادروں کا گیت تھا جنہوں نے اپنی آزادی کی خاطر جانوں کی قربانیاں دے کر روسی تاریخ میں ابدیت حاصل کی تھی۔ عوام کے پاس ان کی قربانیوں کا صلہ دینے کے لئے اور کیا تھا۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں ان کو غیر فانی بنا دیا۔ ایک بار لینن نے ایک مزدور عورت کو جو اُس کے مکان کی چھت کی مرمت کرنے آئی تھی۔ ایک گیت گاتے سُنا جو اس کے ذہن پر نقش ہو گیا۔ بول تھے :-

"اے جرمن درندو تم نے الساک اور لارینی فتح کر لیا۔ پھر بھی ہم فرانسیسی ہیں۔ تم ہمارے کھیتوں، ہماری زمینوں، ہمارے ملک کو (GERMANIZE) اپنا سکتے ہو۔ لیکن ہمارے دلوں کو نہیں۔"

یہ تھا فنِ موسیقی سے اس کا لگاؤ اور جہاں تک لٹریچر کا تعلق ہے۔ ٹالسٹائی کے متعلق لینن کی تصانیف کے علاوہ اس کے بے شمار ادبی پارے روسی ادب میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بہت سی غیر ملکی زبانوں اور ان کے ادب سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ قدیم و جدید ادب پر اس کو یکساں عبور تھا۔

اکتوبر کے انقلاب سے قبل عوام کو (TSARIST CENSOR) کے اثر سے بچانے کے لئے وہ اپنی تقاریر میں روسی طنز نگار گوگل، گری بوائے، اگرشیلو، کے ادبی شہ پاروں سے حوالے پیش کرتا۔ جن کو سُن کر عوام اس کی ادبی معلومات اور ذہانت پر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ اس کی کتاب "لینن کے ادبی پارے" میں ہم کو اس طرح کے بہت سے واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ جن سے ہمیں لینن کی قدیم ادب کی گہری معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تمام چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اس کی زبردست یادداشت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ وہ اکثر موقعوں پر پُرانے مصنفین کے ہو بہو الفاظ تک نقل کرتا کہ سننے والے ششدر رہ جاتے۔

الگزنڈر پشکن اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف تھا۔ نیڈازڈا (NEDAZHDA) کا کہنا ہے کہ لینن پشکن کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ ایک بار جبکہ وہ ایک صنعتی ادارے کے طلباء سے گفتگو کر رہا تھا تو اس نے لڑکوں سے دریافت کیا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ ایک طالب علم نے جواب میں مایاکوسکی کا نام لیا۔

"میری رائے میں پشکن بہتر ہے۔" لینن نے کہا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ لینن کی نظر میں مایاکوسکی کی ادبی وقعت نہ تھی۔ یا وہ مایاکوسکی کو گرانا چاہتا تھا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ لینن اس کی طنزیہ شاعری کا بہت دلدادہ تھا۔

لیو ٹالسٹائی (LEO-TOLSTOY) کے دقیق اور مشکل نظریات پر لینن کی (ANALYSIS) کا دوسرے ناقدین کے یہاں جواب نہیں۔ وہ لکھتا ہے :۔

ٹالسٹائی کے فن، نظریات، اعتقادات میں ہم کو اکثر تضاد نظر آتا ہے۔

ایک طرف وہ ایک بلند پایہ فنکار ہے۔ جس نے نہ صرف روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مکمل قدرت اور فنکاری سے پیش کیا۔ بلکہ دنیا کے ادب میں درجہ اول کے ادب کا اضافہ کیا۔

دوسری طرف وہی فنکار ایک بہت ہی معمولی انسان کی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ ایک طرف فنکار اپنی پوری قوتِ تخلیق سے سماجی اور سوسائٹی خامیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف وہ ایسے بچے کے مانند نظر آتا ہے جو اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر چلا رہا ہے ــــ میں احمق ہوں، میں کمینہ ہوں۔ لیکن میں ذہنی طور پر مکمل ہوں، میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اب صرف چاول پر بسر کرتا ہوں۔

میکسم گورکی کی تصانیف میں بھی، ٹالسٹائی کے متعلق لینن کے نظریات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گورکی لکھتا ہے :۔

"میں ایک بار لینن سے ملنے گیا۔ اس کی میز پر مشہور ناول (WAR AND PEACE) رکھا ہوا تھا۔ میں عرصہ سے ٹالسٹائی کو پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس مجھے وقت نہیں ملتا۔ کل میں نے ٹالسٹائی کے متعلق تمہاری کتاب پڑھی۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے گوشوں سے میری طرف دیکھا اور اپنی گھومنے والی کرسی میں انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

"وہ ایک بڑا فنکار ہے۔ جس کے تخیل کی پرواز انسانی خیالات کی رسائی سے بہت پرے ہے۔"

پھر اُس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے میرے خیالات کو پڑھ رہا ہو۔ اور پھر کہا۔

"کیا تم یورپ کا کوئی فنکار اس کے مقابلے میں کھڑا کر سکتے ہو؟"

پھر خود ہی میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔

"نہیں ــــ!" جیسے اس سوال کا دوسرا جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

کرسپکایائی (CHERNYSHEVSKY) کی تصانیف بھی ہم کو جابجا روسی ادب کے متعلق لینن کے نظریات پر بہت سی مفید معلومات بہم پہونچتی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

لینن (CHERNYSHEVSKY) کے مشہور ناول (WHAT IS TO BE DONE) کو اس کی بہت سی فنی خامیوں کے باوجود بے حد پسند کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنی مشغولیت کے بعد بھی کس طرح وقت نکال کر اس نے اس ناول کا اتنا گہرا مطالعہ کیا۔ کہ کسی نکتہ کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ جب لینن سائبیریا تھا تو اس کے البم میں اسی مصنف کی دو تصاویر تھیں۔ جن میں سے ایک میں مصنف کی تاریخ پیدائش اور موت خود لینن کے ہاتھ کی درج تھیں۔

ہرزن (HERZEN) کے متعلق بھی لینن بلند رائے رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ایک مضمون "ہرزن کی یاد میں" اس کی ایک تصنیف کے بارے میں لکھا ہے۔ جس میں ہرزن نے ان بہادروں کے بارے میں

اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جنہوں نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں نکولائی اول کی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"وہ بہادر گوشت پوست نہیں بلکہ سچ مچ فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے آزادی کے نام پر جانیں قربان کیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی روحوں کو غلامی کے قید و بند سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور ان بچوں کے درمیان ہرزن خود تھا۔ اس بغاوت کی آگ نے اس کی روح کو تپا کر کندن کر دیا۔ اس کے خیالات اور نظریات کو مثل آئینہ بے داغ بنا دیا اور اسی لئے وہ آج ایک بلند پایہ فلسفی اور ادیب بن گیا۔ اس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ایک روسی پریس قائم کیا جس کے ذریعے ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔ مزدور اور کسانوں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ اس طرح ہرزن نے انقلابی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی"۔

درمیانی طبقہ کے لوگوں میں چرنیشوکی سے لے کر بیلو ملیس ول پارٹی تک عوام نے انقلابی تحریک میں شاندار حصہ لیا اور اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ بہادر سپاہی دور دور سے کھنچ کر ایک دائرے میں شامل ہو گئے۔ پرولتاری ہی ایسا طبقہ تھا جس نے انتہائی جان توڑ کوشش کی اور لاکھوں مزدور کسانوں کو "انقلابی تحریک" میں شامل کیا۔

لینن نے ادب میں اس "انقلابی تحریک" کا رہنما گورکی کو قرار دیا ہے۔

لینن سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں گورکی لکھتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب وہ اپنا شہرۂ آفاق ناول (MOTHER) ختم کر چکا تھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک کشادہ پیشانی، مضبوط جسم والا شخص تھا۔ اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور دوسرے سے اپنی چمکدار چوڑی پیشانی کو صاف کرتے ہوئے جو کبھی غالباً سقراط کی ملکیت ہوگی۔ اپنی چمکدار اور عقلمند آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے انداز میں میری طرف جھکا اور بلا کسی جھجک کے میری کتاب کے نقائص بیان کرنے لگا۔ جن کا مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ اس نے میری کتاب "مدر" کا مسودہ (LANSH-NIKOR) کے پاس دیکھا تھا۔

"میں کتاب کو جلد ختم کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئیں"۔ میں نے کہا اور قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہتا۔ لینن نے ذرا سر کو جنبش دی اور کہا:۔

"ہاں ـــ تمہیں جلد ہی ختم کرنی چاہئے تھی۔ اس کتاب کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایسے لوگوں کے لئے انتہائی مفید ہے جو "انقلابی تحریک" کو بلا سمجھے اس میں حصہ لیتے ہیں جو بسا اوقات "تحریک" کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے تمہاری کتاب "مدر" بے حد مفید ہے"۔

لینن چاہتا تھا کہ اگر گورکی جیسا سمجھدار ادیب پارٹی کے اخبار "دی پرولتارین" کے ادبی سیکشن میں حصہ لے تو ان کی "سرخ تحریک" کو کتنا سہارا ملے۔ اس کی نظر میں گورکی سے بہتر دوسرا شخص اس کام کو خوش اسلوبی سے سنبھالنے والا نہ تھا۔ چنانچہ اس نے "اناٹول لونا" کو ایک خط میں لکھا:۔

"میں ایک عرصہ سے سوچ رہا ہوں کہ پارٹی کے اخبار کا ایک مستقل ادبی سیکشن قائم کر کے اسے گورکی کے سپرد

کر دوں۔ لیکن ہر بار ایک خوف اور جھجک محسوس کرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرا یہ عمل اس کے ادبی مشاغل کو کسی طرح کا نقصان پہونچائے اور میرے نزدیک یہ ایک ادبی اور اخلاقی جرم ہوگا۔ چونکہ تم وہاں موجود ہو اور حالات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔ اس لئے اگر مناسب سمجھو کہ پارٹی کا یہ کام گورکی کے سپرد کرکے اس کی ادبی ضرورتوں کو نقصان نہ پہنچائیں گے تو تم اس کے لئے کوشش کرو۔ کاش ایسا ہو سکتا۔"

روسی ادب کی ترقی، اس کی فلاح اور بہبودی کے بارے میں لینن کا کہنا ہے کہ روس کے بچے بچے کو ترجینوف (TURGENEV) اور ٹالسٹائی کی زبان جاننی چاہئے۔

".... ترگنیو، ٹالسٹائی، شرنیوسکی کی زبانیں با اثر اور پُر زور ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام زبانیں ایک دوسرے کے نزدیک ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی زبان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لئے ہر اس شخص کو جو روس میں ہے خواہ وہ کسی بھی ملک کا ہو چاہئے کہ ہماری زبان سیکھ کر ہمارے ادب سے پورا پورا فائدہ حاصل کرے جو ہماری سرزمین میں آباد ہے ہم اُسے اپنا سمجھتے ہیں اور اس کی ہر ممکن خدمت ہمارا فرض ہے۔"

لینن۔۔ جس طرح اپنی زبان پر فخر کرتا تھا۔ اُسی طرح اپنے ملک اور قوم پر بھی ناز کرتا تھا۔ "روسی قوم کے لئے ہمارے دل محبت اور خلوص کے سچے جذبات سے معمور ہیں۔ روسی قوم آزادی کی مہم میں ساری دُنیا سے آگے ہے۔ روسی زمین بہادر سپاہیوں کو جنم دیتی ہے۔ ایسے سپاہی جو آزادی کی جدوجہد اور ملکی ترقی کے لئے شمشیر بکف رہتے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے بیتے ہوئے غلامی کے دنوں کے نام تک سے نفرت کرتے ہیں۔"

لینن کی علمی لیاقت اور ادبی معلومات کے بارے میں ہم اوپر بھی کہہ چکے ہیں۔ وہ بہت سی غیر ملکی زبانیں مثلاً انگریزی جرمنی، فرانسیسی اچھی طرح جانتا تھا اور ان زبانوں کے ادب سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا۔ اس کے البم میں ہم کو غیر ملکی زبانوں کے اچھے اچھے ادیبوں کی تصویریں بھی ملیں۔ خود اس کی تصانیف میں گوئٹے۔ ڈیکنز، ہیوگو، ہائینن اور بہت سے دوسرے اچھے اچھے مصنفین کی تصانیف سے حوالے ملتے ہیں جو اس کی علمی اور ادبی معلومات کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

ہمارے کلچر۔۔ اور ادب کا مستقبل کیا ہوگا، اس کا جواب لینن کے ہی الفاظ میں سنئے:۔

"ہمارا آئندہ ادب پرانی قدروں سے آزاد ہوگا۔ جس کی بنیاد خود ستائی پر نہیں بلکہ سوشلسٹ نظریات پر ہوگی۔ عوام اور مزدور طبقہ کی ہمدردی ہمارے ادب میں سچا زور پیدا کردے گی۔ ادب میں نئی روح عود کر آئے گی۔ اس لئے کہ وہ ادب کسی مہ جبین کی تعریف کے لئے تخلیق نہ کیا جائے گا۔ بورژوا طبقہ کے ان چند انسانوں کی (جن کی توندیں خالص چربی سے پھول کر مشک بن گئی ہیں) خوشنودی کے لئے نہ لکھا جائے گا۔ بلکہ وہ ہزاروں، لاکھوں، مزدور کسانوں کی زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ اور یہ ہوگا دنیا کا سچا اور لافانی ادب۔"

اخیر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جوزف اسٹالین، لینن کے بارے میں بحیثیت کلچرل اور سائنٹفک نمائندے کے کیا خیالات رکھتا ہے۔

مئی ۱۹۳۳ء کی بات ہے کہ اس نے یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے سامنے کہا:۔

"لینن۔۔۔ سائنس، ادب، اور کلچر کے لئے روشنی کا مینار تھا۔ اس نے غلط قدروں کے خلاف بہادری کی روح پھونک دی اور اس طرح نئی قدروں، نئے اصولوں، اور نئی روایات کی بنیاد ڈالی۔"

(ترجمہ)

احمد راہی

غزل

کانٹوں میں دامن اُلجھایا سایۂ گُل بھی راس نہ آیا
ہم من مانی کرتے رہے گو لاکھ زمانے نے سمجھایا

تیرے دلکش وعدوں کا زہراب گوارا کون کرے گا
تُو نے کس کا دُکھ جھیلا ہے، تُو نے کس کا درد اپنایا

تجھ کو ہماری بربادی کا آج بھی کچھ احساس نہیں ہے
تیری ضد پر سادہ لوحوں نے اپنا سکھ چین لٹایا

صدیوں کی جانکاہی سے بھی ہم جس کو سُلجھا نہ سکے تھے
تُو نے اپنی تدبیروں سے اُس اُلجھن کو اور اُلجھایا

تجھ کو خبر کیا کتنے نغمے نوحوں میں تحلیل ہوئے ہیں
تجھ کو خبر ہو بھی تو کیونکر، تُو نے جو چاہا وہ پایا

مایوسی میں عمر کٹی تھی، آس نے انگڑائی سی لی تھی
سوچا تھا قسمت بدلے گی، لیکن ہم نے دھوکا کھایا

میرے بس کی بات نہیں تھی، میرا کوئی دوش نہیں تھا
ناحق تم نے مجھ کو بھی دشمن سمجھا مجرم ٹھہرایا

بہرو اندھیروں کا ماتم بے وقت کی شہنائی ہے راہی
دیکھ اُفق کی پیشانی پر کرنوں کا سہرا لہرایا

انتظار حسین

استاد

سگاگی تو خیر کسی بات کا اعتبار ہی نہیں۔ وہ تو دن دن کی ہانکتا ہے۔ پر ہمارے گھر والے بھی سب یہی کہتے ہیں کہ استاد کا زمانہ بس دیکھنے کے لائق تھا۔ سارے شہر میں ان کی دھاک تھی۔ دنگل میں، پتنگ کے پیچوں میں، شب برات کی لڑائی میں بس ہر بات میں استاد کی پارٹی کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ ایک دفعہ تو لاہور اور جالندھر تک کے پتنگ باز آگئے۔ تین دن تک تو پیچ لڑتے رہے۔ جالندھر والوں نے اپنے سارے مانجھے آزمالئے اور ان کے ہاتھ کی صفائی تو جبھی غضب کی تھی۔ کھینچ کے پیچ میں تو جواب نہیں رکھتے تھے۔ لیکن استاد نے بھی وہ ہاتھ اٹھائے۔ کہ بھائی لوگ چوکڑی بھول گئے۔ کہتے ہیں کہ تیسرے دن آکے لاہوری نے استاد کے ہاتھ چومے۔ اور یہ تو خیر مانی ہوئی بات ہے۔ کہ رئیسوں کا ان کے نام سے دم خشک ہوتا تھا۔ سیٹھ گردی شنکر جو بڑا تنک چڑھا بنتا تھا۔ اس کی ہمت اب تک پتہ نہیں ہے۔ جس کسی نے ذرا ناک بھوں سکیڑی اس کے بیچ بازار میں جوتے لگوا دیئے۔ اور رئیسوں پہ یہی کیا ہے۔ افسروں سے بھی دم دب کے تھوڑا ہی رہتے تھے۔ داروغہ ہرگیان سنگھ نے اور کیا کیا تھا۔ تعزیوں کے آگے آگے گھوڑے پہ چل رہا تھا۔ بس استاد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو شیخ جی، نمبودار، صوفی جی سب نے حلق داب دیا نہیں تو کیا ہو جاتا۔ بات چھپی تھوڑا ہی رہتی ہے۔ داروغہ کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی۔ کلام مجید کی قسم سٹی پٹی بھول گیا۔ گھوڑے سے فوراً ہی تو اترپڑا اور جھٹ ہاتھ سے پھینکدی۔

یہ باتیں ہمارے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ لیکن اتنا تو ہمیں بھی یاد ہے۔ کہ بیٹھک کا جو حصہ استاد کے پاس ہے۔ اس میں تین چار تگڑے پٹھے ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ بس ہر بات کا موسم ہوتا تھا۔ اگ مانجھا سوتا جا رہا تھا۔ تو مانجھا ہی سوتا جا رہا ہے۔ لگدی میں ایسی ایسی چیزیں پڑتی تھیں۔ کہ کسی کو ان کی ہوا بھی نہ لگی ہوگی۔ یوں ہمیں وہ مانجھا دے دیتے تھے۔ لیکن لگدی کو کبھی ہاتھ نہیں لگنے دیا۔ ایک دفعہ تو نے گھیکوار کا پٹھا نالی میں پھینک دیا تھا۔ تو سارے گھر میں آفت آگئی تھی۔ شب برات کے کئی مہینے پہلے سے پٹاخے تیار ہونے لگتے تھے۔ اناروں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ اور پھر بھی استاد یہی کہتے رہتے تھے۔ کہ ابھی اب کے تیاری پوری نہیں ہوئی۔ لیکن اب تو وہ زمانے ہی گذر گئے۔ استاد کی نہ وہ عمر رہی نہ وہ ٹولی رہی۔ نہ وہ شوق رہے اب تو وہ کوٹھڑی میں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ الماری میں تین چار خالی چرخیاں پڑی ہیں۔ جن پر ڈور چڑھی ہوئی تھی۔ نہیں معلوم کتنوں لے کے چلتے بنے۔ تھوڑی سی پتنگیں بھی ٹنگی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ بھی ایسے ہی کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب کوئی بچہ بہت روتا دھوتا ہے۔ تو استاد اسے ایک پتنگ دے دیتے ہیں۔ اور توبہ کرا لیتے ہیں۔ کہ اب کبھی نہ مانگے گا۔ پتنگ دینا اور توبہ کرانے کا لگا ہی رہتا ہے۔ اور پتنگیں برابر کم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بیٹھک کے چبوترے پر چھپر کا ڈھونا دنوں سے بند ہو گیا ہے۔ مونڈھا بھی بس ایک ہی رہ گیا ہے۔ باقی سب ٹوٹ گئے اور اب ملنے والے بھی تو ایسے زیادہ نہیں آتے۔ چوک کے بھی سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ چبوترے کے سامنے بازار ہے ہاں اس کی رونق بڑھ گئی ہے۔ استاد صبح شام چبوترے پر آبیٹھتے ہیں۔ چوکی کے ایک کنارے پاکڑوں بیٹھے ٹھیا زمین پر ٹیکے وہ گھنٹوں بازار

کی بیڑ کو تکتے رہتے ہیں۔ کسی نے چلتے چلتے سلاما علیکم یا نمستے کر دی تو جواب دے دیا نہیں تو گم سم بیٹھے رہتے ہیں۔ کمان کی ہیں اُداس اُداس خاموشی میں بھی ایک بڑا پن ہے۔ انہیں چوکی پہ اکیلے بیٹھے دیکھ کر بس ایسا لگتا ہے۔ کہ جیسے کوئی بہت بڑا رتیلا میدان ہے۔ اور اس میں ایک بہت اونچا بڑ کا پیڑ کھڑا ہے۔ اور اس کے سارے پتے جھڑ گئے ہیں۔ استاد اپنی بیٹھک میں بالکل اکیلے رہتے ہیں۔ پٹھے ایک ایک کر کے سب چل دیئے اور رہتے بھی کیسے استاد کا ہاتھ خود تنگ رہتا ہے ایک سگا رہ گیا ہے۔ جواب بھی استاد کی خدمت کئے جاتا ہے۔ سگا پٹی بہت ہے۔ لیکن ایک بات ہے۔ لونڈے پٹانے میں نمبری ہے۔ اور پھر بے پیسے کے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے۔ کہ کھلا نا چٹانا عورت کا ہے۔ لونڈا تو طمانچہ سے قبضہ میں آتا ہے ادھر اُدھر کی خبریں بھی وہی چھن چھن کے لاتا ہے۔ نہیں تو اُستاد سے کون کیا کہتا ہے۔ اب تو نئے نئے اُستاد ہیں اور نئے نئے پٹھے ہیں کہنے کو تو یہ استاد اور خلیفے ہیں۔ لیکن بھئی خدا کی قسم استاد کے مقابلہ میں تو وہ بالکل سفلے لگتے ہیں۔ وہ بات ہی نہیں۔ نہ وہ دبنگ پن نہ وہ بیکڑی۔ ہر بات سے چھچھور پن ٹپکتا ہے۔ اب نہ اکھاڑوں میں وہ رونق رہی۔ نہ دنگلوں کی وہ شان باقی ہے۔ یہ نئے نئے پٹھے جو اپنے آپ کو رستم الزماں سے کم نہیں سمجھتے زور دور تو کیا کرتے ہیں۔ بس چوما چاٹی کر لیتے ہیں تعزیئے اب تین گھنٹے کے اندر اندر کربلا پہنچ جاتے ہیں۔ اور جناب ایک وہ زمانہ تھا کہ پرانی بندیا میں پہنچتے پہنچتے بندے آ جاتے تھے۔ ایک سے ایک بڑھا ہوا اکھاڑہ ہوتا تھا۔ دلّی اور لاہور تک کے خلیفے آتے تھے۔ اور اُستاد کا ہاتھ ہاتھ چوم چوم کے جاتے تھے۔ سگا بتا رہا تھا کہ پنڈت والوں نے منگو کو پگڑی پہنادی ہے۔ واہ ری خدا کی قدرت منگو اور پگڑی۔ استاد ہوں کر کے چپ ہو رہے۔ جب منگاتے پھر منو کا تو تھلا پڑے کہ اپنے پگڑی بندھتی ہے تو بندھنے دے۔ ہمیں انہوں نے بلایا نہیں ہمیں لڈو نہیں بھیجے۔ ہم کیوں اعتراض کریں۔"

عجیب مزاج ہے اُستاد کا بھی۔ ہر بات پر بڑا لمبا سا ہوں کر دیتے ہیں۔ اور کوئی زیادہ اِدھر اُدھر کی باتیں ملاتا ہے تو پھر جھلانے لگتے ہیں۔ بھئی پہلے تو ایسے تھے نہیں۔ یہ چڑچڑا پن تو اب ان میں آگیا ہے۔ اب تو بالکل اکل کھرے ہو گئے ہیں۔ بات تو بات کسی کا بیٹھنا بھی انہیں اپنے پاس اچھا نہیں لگتا۔ مٹن بھائی کبھی کبھی چھونزے پر اپنی ٹولی جما لیتے ہیں۔ لیکن اُستاد کو ان کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ہاشمی صاحب، مچھن میاں بھائی شاکر اور حبیبتی کون کون آ ڈٹتے ہیں۔ اور پھر دیکھو زمین آسمان کے قلابے ملا ڈالتے ہیں۔ استاد ویسے بستے تو کچھ نہیں۔ لیکن بس ایک رنگ آتا ہے ایک رنگ جاتا ہے۔ اور جہاں کسی نے انگریزی میں باتیں کیں۔ تو پھر تو اُستاد کی حالت کچھ نہ پوچھو۔ یہ ہاشمی صاحب کی عادت ہے کہ ویسے تو بات اُردو میں کئے جائیں گے۔ لیکن جہاں ذرا جوش میں آئے۔ بس پھر گٹ پٹ کرنے لگتے ہیں۔ خیر صاحب وہ تو پڑھے لکھے ہیں لیکن چھن میاں کیا ہیں۔ جو انگریزی میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل اُنہوں نے ایمی بھی پڑھ کے ہی نا دیا۔ ہر سال فیل ہر سال فیل۔ ایک دفعہ بڑی شرم آئی تھی۔ تو پٹری پر جا لیٹے۔ یار میرا خود تو ریل کی آواز سن کے بھاگ آیا۔ اور اس بیچارے بنئے والے کو مفت میں مروا دیا۔ یہ مچھن میاں بھی بس اللہ کے جی ہیں۔ بالکل گر گنیش، کچھ نہیں آتا جاتا۔ بس دو باتوں کی انہیں فکر رہتی ہے۔ کھانے کی اور ممبری کی۔ لیکن دعوت ہووے ہے تو ایسے منہ ٹلے ہیں۔ کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یار میرے کو کچھ ہی کہے جاؤ۔ جوں نہیں رینگتی۔ چکنا گھڑا ہے چکنا گھڑا۔ کھانے کی چیز تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے۔ لیکن اپنی گانٹھ سے کبھی خرچ نہیں کرتے۔ بڑے کنجوس مکھی چوس ہیں۔ دھیلا جو خرچ کر دیں کسی پر۔ بس جی ان کا پیسہ کسی کو لگا ہے۔ تو وہ گری والا ہے۔ اسے تو خوب جانتے ہیں۔ مٹن بھائی نے بھی صاف ہزار مرتبہ کہا ہو گا کہ "اے

مچھن بھئے یہ تیرا سارا پیسہ کیا اس ہنیچ گدی والے پر ہی بھینٹ چڑھنے کو رہ گیا ہے۔ کبھی تو اپنے ماموؤں کی دعوت کر کرا دیا کر۔"
لیکن وہ ایک کان سے سنتے ہیں۔ دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں۔ اور ایک ممبری کا خناس ان کے دل میں سما گیا ہے۔ پہلے کانگرس
میں تھے۔ اب لیگی ہیں۔ اور کیا لگے ہے آگے چل کے حسین کیا بن جائیں۔ پر وہ بھی ممبر بن ہو کے تا دیتے۔ اجی کیا ہو تعذ اغلول میں
بالکل۔ لیکن خیر زاغلول تو یہ سب ہی ممبر ہوویں ہیں۔ جنہیں یہ ہنیچ کیا بات ہے۔ کہ ہمارے ہاں جتنے زاغلول ہیں۔ سب ممبری
کے چکر میں رہوے ہیں۔ اور جی یہ جو روپیہ ممبری پہ پانی کی طرح بہاویں ہیں۔ بعد کو کیا مل جاوے ہے۔ چوکھا حساب تو ہاشمی حساب
کا ہے۔ سرکار کو ایک دو سلام جھکا آئے اور سرکاری ممبر بن بیٹھے۔ سرکار کو سلام کرنے میں عزت تھوڑا ہی جاوے ہے۔ بڑے
آدمی تو بس ہاشمی صاب ہیں اور بس یونہی ہیں۔ سارے کلٹروں کمشنروں کو جانے ہیں۔ ہر ایک کے پاس جاتے رہویں ہیں۔
کوئی دورے پر آوے ہے تو اپنے گھر پر دعوت کرے ہیں۔ لیکن بھیا اس سرکار کی بھی کچھ نہ پوچھو۔ جس نے اسے دو چار سلام جھکا
دیئے اسے بڑا آدمی بنا دیا۔ شیخی کی بات تو ہے نہیں پر کوئی گھر آئے کمشنر آئے۔ استاد کبھی کسی کو سلام کرنے نہیں جاتے
ہم یہ کہوے ہیں۔ کہ اگر استاد ممبری کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ تو کیا ممبر نہ بنیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان
استاد کو سب مانتے ہیں۔ لیکن وہ تو ایسے چکروں میں ہی نہیں پڑتے وہ کسی سے بات تو کرتے ہی نہیں۔ اب ہم ہی دیکھ لو۔
کرشن بھائی کی ٹول جہاں جمی اور جہاں ٹھٹھے لگنے شروع ہوئے تو استاد ٹھہر نہیں سکتے۔ کھانستے کھنکارتے اپنی کوٹھری
میں چل دیتے ہیں۔ ان کی تو بس بڈھوں ٹھڈوں سے چھنتی ہے۔ جگو پنڈت آ بیٹھتے ہیں۔ تو ان سے خوب باتیں کرتے ہیں۔
اگلے پچھلے سارے مردے اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ ان کی باتیں سننے میں ایسا مزہ آوے ہے۔ جیسے رستم اور افراسیاب کا قصہ
سن رہے ہیں۔ ایسی باتیں بس وہ بڈھوں سے ہی کر لیتے ہیں۔ اوروں سے انہیں دشمنی ہے۔ نفرت ہے۔ جنہیں کیا ہے
کسی نے ذرا بات کی۔ اور اسے گھرک دیا۔ اب دیکھو شمی آیا تھا۔ استاد نے اس سے بھی ایسی بات بات نہیں کی۔ شمی اب
بنارس چلا گیا ہے۔ پہلے استاد کے ہی پاس رہتا تھا۔ اس کا بڑا اچھا بدن تھا۔ استاد اسے سب سے اچھا جوان سمجھتے
تھے۔ لیکن بدن تو کھلائی سے نکلتا ہے۔ محنت مزدوری میں کیا خاک کھلائی ہو گی۔ اس کی وہ بات ہی نہیں رہی۔ استاد تو
اونگھتے اونگھتے سو گئے۔ کوئی بارہ ایک بجے تک وہ سگا سے باتیں کرتا رہا۔ سگا نے بھی اسے ادھر ادھر کی ساری باتیں
بتا ڈالیں۔ کہنے لگا "بیٹا شمی۔ اب تو یاں خون کی ندیاں بہیں گی" شمی کو دین دنیا کی کیا خبر۔ گھبرا کے بولا "اے کیا؟"
سگا اس کے اور قریب سرک آیا۔ اور کہنے لگا "یہ سالے کوت تو مسلمان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ دیکھنا کوئی
بنیا ایسا نہیں ہے۔ جس کے گھر میں تیزاب اور پسی ہوئی مرچیں نہ ہوں۔ رات بھی پار پڑ والی گلی میں بیسیوں لٹھیا گئی ہے۔
لیکن شمی ہمارے پاس بھی ایک ایک انار اور سینگ ایسا ہے۔ کہ ان کی بھلیاں بکھیر دے گا۔"

شمی جماہی لیتے ہوئے بولا "اے یار یہ ہم سے کیا لڑیں گے ...... اور اے ہاں سگا یہ تو بتا یاں کوئی پٹھا
وٹھا بھی نکل رہا ہے؟"

"دو پٹھا نکل رہے پٹھے۔ گئی ہوا بھیا۔ ایک نواکو تجھڑے والے کو سمجھ لو۔" اور پھر لمبی سی سانس بھرتے ہوئے بولا "
استاد کا زمانہ ہی نہ رہا نہیں تو میں .... اور بھئی شمی تو ہی انصاف کی کہیو۔ استاد تو برا مان جاتے ہیں
میں نے ہزار مرتبہ کہا کہ استاد اب پہلا سا وقت نہیں رہا۔ بیگم بتیس دانتوں کے بیچ میں زبان ہے۔ پہلی بات اور
تھی کسی سالے کی ہمت نہیں تھی۔ کہ ہم جو نترے کے پاس سے بغیر سلام کئے نکل جاتا۔ وہ یاد نہیں ہے۔ کہ شنیچر جی گھسی ہیں

نکل رہے تھے۔ للّو پنساری چرپائی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہیں سے سالے ہنڑو یا سانڈ سے۔ لیکن بھیا اب وہ زمانے کہاں ہیں۔ ایسا ہی للّو پنساری کا لونڈا اکھاڑے میں جاکے زور کرے ہے"۔

شمی نے اکتاتے ہوئے پھر ایک لمبی سی جمائی لی "یہ بیچ سالے زندگی کہی کیا ہماری پونچھ اکھاڑیں گے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ابے او للّو۔ للّو۔ ابے کیا بیچ گیا ہے"۔

"پہلوان۔ یاسے"

"یاسے۔ دہت تیری ماں کی دم میں کھٹکھٹا ہی جگہ رہ گئی ہے رونے کے لئے"۔

اِس سالی بل کی بھی کچھ نہ پوچھو۔ اگر اسے ڈانٹیں نہیں تو ساری رات روو ے۔ استاد کی ہٹیلی ہے نہیں تو اس کے تو ہم توس بکھیر دیتے۔ اِس کے مزے تو جب تھے۔ جب ہندو مسلمانوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ سارا محلّہ ہی خالی ہو گیا تھا اس چھت پر گئی رونا فی۔ اُس چھت پر گئی رو آئی۔ صاب لڑائی کا بھی کیا سماں تھا۔ دل کانپتا ہے سوچ سوچ کے۔ دیکھتا ہے ساری سڑک خالی پڑی رہتی تھی۔ بس ایک سناٹا سا تھا۔ کبھی کبھار سپاہی کھٹ کھٹ کرتے نکل جاتے تھے۔ یا ایک ساتھ خوب شور ہونے لگتا تھا۔ اور اس کے بعد سناٹا اور گت چوگنا اٹھ گن ہو جاتا تھا۔ للّو کی بنچ پہ ہم تو کبھی بیٹھ نہیں سکے۔ پان کھانے والے ہی اتنے آتے تھے۔ کہ کھڑے رہتے تھے۔ لیکن بھیا اس زمانہ میں تو وہ کالا کالا مریل کتا اس پر لوٹ لگایا کرتا تھا۔ اور یہ کتے انہیں ویسے تو منڈیروں اور کوٹھوں پر بھی چین نہیں ملتا۔ لیکن پتلے جب تو بیچ سڑک پر چہل کیا کرتے تھے۔ اجی یہ بھی کیا اپنے دلوں میں سوچتے ہوں گے اس زمانہ میں۔ رات کو پیچھے والی گلی میں لوگ لٹھ لئے بیٹھے رہتے تھے اور چائے بنتی رہتی تھی۔ ہمیں تو آپا جی نے گھر سے نکلنے دیا ہی نہیں۔ کبھی دبکا چوری سے نکل جاتے تھے۔ تو مستیا اور بدلو ٹوک دیتے تھے "شیخ جی گھر میں بیٹھو" اور مشن بھائی کی تو بس کچھ پوچھو ہی مت، جہاں شور ہوا۔ اور اُنھوں نے سمجھا کہ ہندو چڑھ آتے۔ ہاں اُستاد اپنی لٹھیا ٹک ٹک کرتے گلی میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ اور لوگوں سے جنہیں کیا کیا کہتے رہتے تھے۔ مشن بھائی نے یہ بات تو ان سے کئی دفعہ کہی۔ کہ وقت ایسا ہی ہے للّو سے الگ رہا کرو۔ لیکن وہ کہاں سُنتے ہیں کسی کی۔ لیکن بھیا بخش الٰہی کی دوکان میں جو آگ لگی ہے۔ تو ہماری جان ہی تو نکل گئی۔ مستیا اور بدلو کو تو سپاہی پکڑ کے لے گئے۔ باقی سب جنہیں کہاں چلے گئے۔ کیا آگ لگی تھی۔ بخش الٰہی کی دوکان میں بھی۔ یہ بڑے بڑے ٹرنک اور صبح چل جلا کے کھڑاک ہو گئے۔ یاں ایسی ایسی چمکیلی چیزیں تھیں کہ ہماری تو آنکھیں چکا چوند کھا جاتی تھیں۔ ساری دوکان بس جگمگ جگمگ کرتی رہتی تھی۔ لیکن اب تو سارے میں کالونس پتی ہوتی تھی۔ بس ایک چوہوں کی آنکھیں ضرور چمکتی رہ گئی تھیں۔ رات بھر کھڑ کھڑ کرتے تھے۔ اور جب جلے بھنکے خالی ٹرنکوں میں دوڑتے تھے تو ایسا لگتا تھا۔ جیسے جن چل دیتے ہوں۔ ہاں اُستاد کو دیکھو وہ کہتے ہیں یہ جٹیل سالے آگ لگائی ہے جیسے پھلجھڑی چھوڑ دی۔ اس سے زیادہ تماشہ تو ہم گولی کی لڑائی میں کر دیا کرتے تھے"۔ مشن بھائی کی بُری حالت اور اُستاد کیوں کہیں یاں سے سرکوں نہیں۔ اُستاد سے کوئی بولا اور وہ بگڑ کھڑے ہوئے "ابے ہم نے وہ زمانے دیکھے ہیں۔۔" مشن بھائی تو بات کاٹ دیتے "ہاں بڑے زمانے دیکھے ہیں۔ وہ زمانے اور تھے۔ خود ہی مر جائیں ہمیں بھی مروا دیں گے۔ لیکن آخر کیا کرتے استاد ٹوٹے نہیں۔ ہم وہاں سے اُٹھ گئے۔ بچارے تھانیدار صاب مشن بھائی کا بڑا پاس کرتے ہیں۔ سٹیشن تک خود ساتھ گئے۔ ہمیں تو خبر نہیں کہ پھر بھیا کیا ہوا۔ بڑا آدمی مارا گیا اِس لڑائی میں صاب۔ لیکن مرتے مرتے گھر پر تو اللہ نے

بڑی خبر کی۔ اور ہمارا خیال تو ایسا پڑے ہے کہ آدمی نیچ ذات کا ہی سارا مارا گیا۔

استاد اب بھی ویسے ہی گم صم بنے بیٹھے رہتے ہیں بلکہ اب تو ان کی خاموشی بڑھ گئی ہے۔ مشن بھائی، ہاشمی صاحب، چھن میاں، بھائی شاکر جب چبوترے پر آکے بیٹھتے تھے تو اپنی بہادری کے قصے خوب سُناتے ہیں۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔ بس تھر تھری سی اُٹھتی ہے۔ بھائی شاکر ٹھیک کہتے ہیں۔ کہ ایسے وقت میں تو جان بچا لے جانا ہی بڑی بہادری تھی"۔ استاد سے بھی وہ بہتیرا پوچھتے ہیں۔ کہ کیسی کیسی گذری۔ لیکن اُستاد ہوں ہاں کر کے چپ ہو جاتے ہیں کیسی عادت ہو گئی ہے اُستاد کی۔ کوئی کیسی ہی بات کرے ان سے، لیکن وہ ٹرا کے ہی جواب دیتے ہیں۔ اب اس روز سگا نے انہیں تو ایک پرائیویٹ بات بتاتی کہنے لگا "استاد آج تو جگو پنڈت کو کر لیا"۔ بس پھر کیا تھا۔ مُنہ تن گیا۔ ویسے بولے وے تو کچھ نہیں مگر ہم تو جانتے ہیں۔ اس کی کیرا ایسے شوق سے پکوائی تھی۔ جب سگا لے کے آیا۔ تو اسے ایسی بُری گالی دی کہ وہ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گیا۔ ویسے تو کچھ بتاتے نہیں۔ اور جب باتیں ہوتے ہوتے کنٹرول اور راشن کی ہونے لگتی ہے۔ اور مشن بھائی کہنے لگتے ہیں۔ بیچارے ڈی۔ٹی۔آر۔ اور صاحب میرا ویسے بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے تیس تیس گز لٹھے کا پرمٹ بنوا لیا۔ لیکن صاحب بار بار کہتے ہوئے ڈرتا . . . . "۔ اور استاد ایک ٹھنڈی سی سانس لے کے کہنے لگتے ہیں "کیا وقت ہے سالا بہادری ہی اُٹھ گئی دُنیا سے . . . . . نامرد . . . . . ہیجڑے . . . . . "۔

ویسے استاد جو کہیں ہیں کہیں ہیں پتہ کی کہی بات یہ ہے کہ اُستاد نے دُنیا دیکھی ہے۔ یہ بات تھوڑا ہی ہے۔ کہ صبح ہی دفتر چلے گئے اور شام کو پٹے پٹائے گھر چلے آ رہے ہیں۔ اماں استاد نے بڑے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ ہاں تو وہ جو کہا کرتے ہیں۔ کہ اس سالے جینے کا مزہ نہیں رہا تو یہ بات تو ذرا ٹھیک کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جینے کا مزہ تو اُستاد کے زمانہ میں تھا۔ اب کیا ہے خاک اُڑتی ہے۔ چین اُٹھ گئے چین اُڑا گئے۔ بھائی لوگ تو کرموں کا پھل بھگت رہے ہیں۔ اب تو جو دن خیر سے گذر جائیں غنیمت ہی سمجھو۔ یہ سالی زندگی تھوڑا ہی ہے بھاگتے کی لنگوٹی ہے۔ نہ وہ کھانا نہ وہ پینا نہ وہ کھیل نہ وہ پارٹیاں۔ یہ ہاشمی صاحب بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ مگر وہ جو کسی نے مثل کہی ہے کہ بھرم بھاری پیٹ خالی تو بھیا وہی بات ہے۔ کہنے کی بات تو بات نہیں اس میں اپنا ہی بھرم جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا ان کے صبح کی چڑنکیاں پکتی ہیں وہ اصلی گھی کی ہوتی ہیں۔ اور جی کوئی اصلی گھی کھانا بھی چاہے۔ تو اصلی گھی رکھے کہاں ہیں۔ ایک اُستاد کا زمانہ تھا کہ بیٹھک میں صبح ہی صبح بدام گھٹنا شروع ہو جاتا تھا۔ شمی اور سگا، اور جنہیں کہاں کون اکھاڑے سے سیدھے آئے اور ٹھنڈائی کے کٹورے کے کٹورے چڑھا گئے۔ بھیا نہ وہ کھانے پینے رہے نہ وہ آدمی رہے۔ پر ہمیں تو اس بات پر آئے ہے کہ مسیتیا اور بدلو کیسے بے عزت آدمی تھے ہاشمی صاحب اور مشن بھائی اور چھن میاں کے کام میں لگے ہی رہتے تھے مگر جب پکڑے گئے تو کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ حالانکہ مشن بھائی کی عزت وغیرہ کی سے دانت کاٹی روٹی ہے۔ اور ہاشمی صاحب تھانے کو ہلا کے رکھ دیتے۔ وہ کلکٹر صاحب تک کو جانے ہیں۔ اُستاد کے زمانے نہیں دیکھے۔ سگا اور شمی نے وہ وہ بدمعاشیئیں کیں ہیں کہ کیا کرے گا کوئی۔ لیکن مجال تھی کسی سپاہی کی کہ چوں کر جائے۔ اُستاد اپنے آدمیوں پر خون پسینہ ایک کرنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن اب تو سب مطلب کے یار ہیں۔ اپنا اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ کچھ نہیں سب سالا ڈھکوسلا ہے۔ بس ایک اللہ پاک کی ذات سچی ہے۔ اور کیا خبر ہے جی وہ بھی ڈھکوسلا ہی ہو۔ یہ بھینچ دنیا اس سالی پر تو دو پیسے کا مٹی کا تیل چھڑک کے بخش الہٰی کی دوکان کی طرح بھک سے اُڑا دیا جائے۔

قیوم نظر

گیان

تیری ہی صورتِ زیبا مجھے دکھاتے ہیں
یہ مرغزار، یہ میداں، یہ کوہسار، یہ برف
یہ ابر پارے جو چپ چاپ اُٹھتے جاتے ہیں

ترے جنوں نے بدل دی ہے کائنات میری
ہمکتے پیڑ، بھری ندیاں، جواں سبزہ
انہیں کے ذکر میں دُنیا نے پائی بات میری

انہی کے لمس سے ہے نشۂ وصال مجھے
انہی کا عشق ازل ہے انہیں کا حسن ابد
عجیب پھیر میں لایا تیرا خیال مجھے

دمکتا جسم، مچلتی امنگ، کیف گداز
مرے لئے کبھی سب کچھ تھا آج کچھ بھی نہیں
مگر یہ راز کہ میں ہوں شکست کی آواز

افضل پرویز

گورنر جنرل

رموزِ نظامِ خلافت بنا کر سیاست کے آدم کو نکتے سجھا کر
خدا نے فرشتوں کی کونسل طلب کی
فرشتوں سے فرمایا: "تم جانتے ہو. مجھے اور آدم کو پہچانتے ہو
یہ خواہش ہے جن و ملائک کے رب کی
کہ اس کو زمیں کا خلیفہ بنائے" یہ سن کر فرشتے بہت پٹپٹائے

فرشتوں نے کی عرض "آقا و مولا!
ہمارے سر آنکھوں پہ ارشادِ باری مگر اک حقیر التجا ہے ہماری
سیادت سے آدم کی ہے تیرا منشا
کہ یہ جا کے دنیا میں فتنے اٹھائے؟ زمیں پر تری خوں کے دریا بہائے؟
تری حمد کرتے ہیں دن رات ہم ہی
یہ عزت ہمیں کیوں نہیں بخش دیتا خلافت ہمیں کیوں نہیں بخش دیتا؟
کہ ہیں وقفِ مدح و مناجات ہم ہی"

کہا حق نے "میں فرض پہچانتا ہوں نہیں جانتے تم جو میں جانتا ہوں
بتاؤ خلافت کے معیار کیا ہیں؟"
خدا نے انہیں کچھ سکھایا نہیں تھا انہیں کوئی نکتہ بتایا نہیں تھا
وہ کیا جانتے اس کے اسرار کیا ہیں؟

پھر آدم سے حق نے کہا "تم بتاؤ انہیں سب رموزِ خلافت سناؤ"
جھٹ آدم نے "آموختہ" کہہ سنایا
کہا حق نے "میں فرض پہچانتا ہوں نہیں جانتے تم جو میں جانتا ہوں"
فرشتے پکارے "بجا ہے خدایا"

مختار صدیقی

ادب اور مجرمانہ تشخص

جنت کی ایک بہار میں سہ پہر تھی کہ آدم نے اپنی نئی نویلی محبت سے مجبور ہو کر ممنوعہ درخت کا پھل چکھا، اور اس کے بعد آدم اور اُن کے شریکِ گناہ کو تادیب کے لئے اس خاکدان پر پھینک دیا گیا ——— توبہ و استغفار کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جب زمین پر نسلِ آدم کو فروغ ہوا اور آدم کے جفاکش بیٹوں نے اچھوتی دھرتی کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کرنا شروع کیا، تو آدم کے دو بیٹوں میں پہلے ایک عورت پر جھگڑا ہوا، اور پھر رقابت کی یہ آگ دشمنی میں یوں تبدیل ہوئی، کہ آسمانی شعلے کی لپٹ نے ہابیل کی بھینٹ تو منظور کر لی اور آخر کسان قابیل کی قربانی جوں کی توں رہنے دی، غصے سے اندھا ہو کر قابیل نے ہابیل کا خون کر دیا۔ لیکن بعد میں یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ لاش کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے۔ اس پر دو کوّے ظاہر ہوئے، دونوں میں اناج کے دانوں پر جھگڑا ہوا۔ ایک کوّے نے دوسرے کو مار ڈالا اور پنجوں سے زمین کھود کر مردہ کوّے کی لاش ٹھکانے لگا دی ——— چنانچہ قابیل نے بھی ایسا ہی کیا۔

اس دنیا میں پہلے جرم کی یہ پہلی کہانی ہے، اور یہ کہانی ہم تک اُن آسمانی کتابوں کی وساطت سے پہنچی ہے جو مختلف نبیوں پر نازل ہوئیں۔ آخری آسمانی صحیفہ جس میں یہ کہانی دہرائی گئی قرآن مجید ہے۔ اس کی مزید تفصیلات تفسیر کی کتابوں میں عام طور پر اور روضۃ الاصفیا میں خاص طور پر ملتی ہیں جو پیغمبروں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی کتابوں نے ہی انسان کو جرم کی پہلی کہانی سنائی ہے، اور مذہبی تقدس کے خیال نے اس میں دلچسپی لینا سکھایا ہے۔ مگر چونکہ اس دلچسپی کا مقصد یہ تھا کہ اس جرم اور اس سے ملتے جلتے باقی جرائم سے گریز کا سبق سیکھا جائے۔ اور فی ذاتہٖ اس کو شدید قسم کی "نواہی" میں شمار کیا جائے۔ اس لئے بیشمار انسانی نسلوں پر اسی دلچسپی نے ایک پابندی بھی عائد کر دی۔

تحلیلِ نفسی کے ماہر کہتے ہیں۔ اسی پابندی کی بدولت ہم میں ممنوع چیزوں سے ایک خفیہ قسم کی دلبستگی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس دلبستگی کو ان رجحانات سے تقویت ملتی ہے جو ہر شخص میں ہر نوع کے جرم کے لئے موجود ہیں ——— چنانچہ غاروں میں رہنے والے انسانوں کو پہلا علم (بلکہ علوم کا سرچشمہ) مذہب حاصل ہوا، تو مذہبی کتابوں نے انہیں رقابت، اور رقیب کی جان لینے کی کہانی سنائی۔ یہ بھی بتایا کہ جرم کی نوعیت سنگین ہے۔ اس سے مقتول کی لاش چھپا دینا، سخت ضروری ہے۔ کیونکہ پھر یہ بہانہ کام آ سکتا ہے کہ گڈریے ہابیل کی طبیعت میں پہلے سے وارفتگی موجود تھی، نہ جانے کس دُھن میں کہاں نکل گیا ہے۔ مذہبی کتابوں نے حکمتِ خداوندی پر زور دینے کے لئے اس کہانی کا تتمہ یہ قرار دیا کہ ایک کوّے نے دوسرے کو مار کر دفن کر دیا اور اسی سے قابیل نے یہ سبق بھی سیکھا کہ آلۂ جرم جو بقول روضۃ الاصفیا ایک پھاوڑا تھا کوّے کے پنجوں کی طرح خون سے صاف کر لینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے، جب ہابیل کی لاش ملی تو سر کے زخم کی وجہ سے وہ پھاوڑا شناخت کر لیا گیا، اور اس طرح مجرم کا بھی سراغ مل گیا ——— ہزاروں نسلیں گزر جانے کے بعد آج بھی قاتل کا سراغ لگانے میں آلۂ قتل کی اہمیت اتنی ہی ہے، جو مذہبی روایتوں نے اسے بخشی تھی ——— کیا کہانی، کیا واقعات، یہی بتاتے ہیں کہ خنجر، پستول کی گولی، کلہاڑی، گلا گھونٹنے کی رسّی کسی دکھی بے جان چیز نے وہ پوری داستان دہرا دی، جس میں موجودہ زمانے میں آدم کے ایک بیٹے نے دشمنی کی بنا پر آدم کے دوسرے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا چونکہ اب وہ قابیل کی نسبت بہت زیادہ

متمدن ہو چکا ہے، تفریحاً ہی اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگے۔

یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ مذہبی کتابوں نے باقی جرموں مثلاً چوری، ڈاکہ زنی وغیرہ کو صرف گناہ بتایا اور انہیں نواہی میں شامل کر دینے پر ہی اکتفا کی۔ مگر قتلِ عمد کو بڑی وضاحت سے اور ایک مثالی کہانی بیان کر کے پیش کیا۔ اس کی وجہ یہی کہ جملہ مذاہب نے انسانی زندگی کی اہمیت اور اس کی عظمت پر کسی نہ کسی پہلو سے زور دیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مارنے اور جلانے کا اختیار انسان کو نہیں اس کے پیدا کرنے والے کو ہے۔ چونکہ قتل عمد سے جہاں انسانی زندگی کے بنیادی سلسلے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ وہیں ذات خداوندی کے اس حکم و اختیار کی بھی صریح خلاف ورزی ٹھہرتی ہے کہ زندگی اور موت کا مولیٰ وہی ہے۔ اس لئے قتل کی خاص طور پر وضاحت کی گئی ——— خود انسان نے جب جرموں کی کہانیاں کہنی شروع کیں تو قتل عمد کی اس اہمیت کو فراموش نہیں کیا چنانچہ ایسے ادب میں، سب سے زیادہ دلچسپ، اور انہی کی زبان میں سنسنی خیز، وہی کہانیاں ہیں، جو قتل عمد سے تعلق رکھتی ہیں۔

عام طور پر ان کہانیوں کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ کسی خاص مقام پر خاص حالات میں مقتول کی لاش ملتی ہے ——— یہ لاش، انسانی عظمت سے عملی انکار کا ثبوت بھی ہے اور اخلاقی قدروں سے بدترین انحراف کی مثال بھی ——— چنانچہ یہ کھوج ہوتا ہے کہ مجرم کون ہے ۔۔۔۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بڑی تفصیل سے، جائے قتل اور اس عمل کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ قاتل کی شخصیت مبہم اور واضح لکیروں سے نمایاں کی جاتی ہے۔ اور ہو سکے تو مقتول کا بھی کچھ حق ادا کر دیا جاتا ہے۔ قاتل اپنے گھناؤنے فعل سے فراغت حاصل کرتا ہے اور کہانی کے دھندلکے میں غائب ہو جاتا ہے۔ مقتول کی لاش ملتی ہے۔ اور پھر کہانی، پڑھنے والے کو ان حدوں میں جکڑے رکھتی ہے کہ قاتل کو کس طرح قانون کے آہنی شکنجے میں کسا گیا، اس پر اس کا جرم کیسے ثابت کیا گیا، اور اپنے جرم کی بدولت اس نے چند لوگوں کی زندگی میں خصوصاً اور انسانی زندگی کی چلتی دھارا میں جو رکاوٹ پیدا کر دی تھی وہ دور ہو کر سکھ کا دور کیسے لوٹ آیا۔

دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے ——— ہماری اخلاقی قدریں (جن کے ایک خیالی مرکب کو ہم نے "ضمیر" کا نام دیا ہے) یہ دیکھنے کا تقاضا کرتی ہیں کہ جو بدنہاد ایسے گھناؤنے فعل کا مرتکب ہوا، اسے اپنے کئے کی سزا ملی یا نہیں؟ ——— وہ علما جنہوں نے انسانی افعال کے "کیف" اور "کم" کا کھوج لگانے کے لئے لاشعور اور تحت الشعور ہی کو ہر بات کا منبع اور ملجا و ماویٰ قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ضمیر کا یہ تقاضا بھی علت سے خالی نہیں۔ اور وہ علت یہ ہے کہ ہم لاشعوری یا تحت الشعوری دنیا میں ہر ممنوعہ چیز سے شدید دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور یہ دلچسپی اُن ممنوعہ چیزوں سے خاص طور پر وابستہ ہوتی ہے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے عملی طور پر تمام پابندیوں کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ مگر جب ہمیں اس دلچسپی کا احساس ہوتا ہے تو ہمارا ضمیر اس لغزش پر ملامت کرتا ہے اور ہماری شعوری قدروں کو بڑی ٹھیس لگتی ہے ——— چنانچہ ہم بھی افسانہ نگار کے ساتھ اس دوڑ دھوپ میں شریک ہو جاتے ہیں کہ مجرم کا سراغ ملے، یا اگر مجرم پہلے متعارف ہو چکا ہے، تو اسے گرفتار کرا دیں تاکہ ہم اطمینان کا سانس لے سکیں، اور یا اپنے برہم ضمیر کا جی ٹھنڈا کر سکیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک تیسری ایسی دلچسپی نمودار ہوتی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو یا تو مجرم کا سراغ لگاتا ہے، یا اس مجرم پر قتل عمد کا جرم ثابت کرتا ہے جس کے متعلق قارئین پہلے سے جانتے ہیں اور اس طرح مجرم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے ——— اپنے کام کی اہمیت اسے کہانی کا مرکزی کردار بنا دیتی ہے۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کی توجہ اس کے کردار پر مرکوز

کہ مجرم سزا پاسکے۔ اُدھر ان بندھنوں سے بیزاری یہ کہتی ہے کہ نہ پائے تو اچھا ہے ـــــ آخر سمجھوتہ یوں ہوتا ہے کہ مجرم سزا تو پائے لیکن اس کے ہاتھوں جو قانون کا نمائندہ نہیں ہے۔ جو خاکی وردی اور چمکتی ہتھکڑی کے بل پر اس بات کا زندہ اشتہار نہیں بنا پھرتا کہ یہ نہ کرو یہ جرم ہے، لال کتاب میں اس کی سزا یہ لکھی ہے اور وہ سزا دلوانے والا میں ہوں ـــــ

سراغ رساں کی کردار نگاری کا یہی ڈھنگ مدتوں مقبول رہا۔ پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک شخص کام وہی کرتا ہے جس کے لئے ہم نے پولیس کا محکمہ قائم رکھا ہے۔ مگر ہم اسے پولیس والوں سے الگ اور برتر دکھا کر کب تک اپنے آپ کو ایک نفسیاتی دھوکے میں مبتلا رکھیں گے؟ ـــــ آخر لیبل ہی کا تو فرق ہے۔ اور اس سے فائدہ ہی کیا ہے کہ ایک شخص کو تبلے ہمہ شیوہ با ہمہ رو دکھانے کے لئے اتنی عرق ریزی کی جائے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ حقیقت کی دنیا میں اگر قتل عمد کی واردات ہوتی ہے، تو پولیس کے پیشہ ور سراغرساں ہی اس کی تفتیش کرتے ہیں، اور مجرم کو عدالتوں کی ذہنی پیچ و پچانسیوں سے گزارتے ہوئے، واقعتہً پھانسی دلاتے ہیں ـــــ اس استدلال کو DOROTHY SEYERS اور امریکی رچرڈ STEPHENS نے اپنے مخصوص انداز میں امریکہ کے کئی پرچوں مثلاً CRIM TOURNAL اور CRIM وغیرہ میں پیش کیا۔ رچرڈ CRIM خود بھی کبھی امریکہ کے محکمۂ سراغرسانی F B I میں کچھ دن کام کر چکے تھے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ شوقیہ سراغ لگانے والے، چونکہ سراغ رسانی کی تفصیل سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے اپنے طریق کار میں کس طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ یعنی ایسے ناول نگار پولیس کے ضابطۂ کار سے ناواقف ہیں، اس لئے تفتیش کی بنیاد، ایسی خیالی باتوں پر رکھتے ہیں، جن کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، اور قتل عمد اور اس کی کہانی لکھنا بڑی مخصوص حقیقت ہے، ایسی کہانیوں میں خیالی احساس کو اتنی آزادی نہیں ہوتی جتنی عام FICTION میں ـــــ چنانچہ ایسے ناولوں میں COP HERO پیشہ ور سراغرساں کا فیشن چل نکلا، مگر اس میں بھی اپنے نفسیاتی پھیر کو آسودہ کرنے کی ترکیبیں ڈھونڈ لی گئیں ـــــ اور کسی نہ کسی طرح یہ گنجائش نکالی گئی کہ ہمارا پیشہ ور سراغرساں، پولیس والا تو ہے، مگر ان سے الگ اور برتر بھی ہے، مثلاً یہ دکھا دیا گیا کہ اسے محکمے والے اچھا نہیں سمجھتے کیونکہ وہ پھر بھی خدا ترس اور نرم دل آدمی ہے، یا یہ کہ ساتھیوں میں سب سے زیادہ ذہین ہے اس لئے بے ضرورت ضابطوں اور رسمیات کی پرواہ نہیں کرتا ـــ یا یہ کہ پولیس میں رہ کر اس کے ضابطۂ تفتیش سے واقفیت پیدا کر چکا ہے۔ مگر پولیس کا ماحول ایسے عمدہ آدمی کو راس نہیں آیا، اب وہ اس گھٹن سے آزاد ہو چکا ہے۔ اور اب یا تو سراغرسانی کا ایک ذاتی دفتر قائم کر کے کام کرتا ہے، یا آرام کی زندگی بسر کرتا ہے، اور بعض اتفاقات کی ستم ظریفیاں اُسے کسی گھناؤنے جرم کے قریب لے آتی ہیں اور وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر مجرم کو اس کے کئے کی سزا دلوائے۔

قتل عمد کی کہانیوں کے بعد ان کہانیوں کا درجہ ہے جن میں مرکزی کردار کوئی مجرم یا کوئی اوباش شخص ہوتا ہے ـــ یہ کہانیاں عام طور پر چوری، ڈکیتی وغیرہ یا مفت کرم داشتن کی قسم کی عیاشی اور دھوکہ دہی، روپیہ وصول کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہانیاں جرم کی اُن اولین داستانوں میں سے ہیں جو قتل عمد کی کہانیوں سے صدیوں پہلے مرغوب اور مقبول تھیں۔ ان کی بڑی وجہ ان کی کردار نگاری اور مرکزی کردار کی بہادرانہ حماقت، اور اس کی شریفانہ "حرکات" تھیں۔ عام طور پر ان کہانیوں کا ہیرو سماج کا ستایا ہوا کوئی عالی خاندان شخص ہوتا تھا، جو سماج کے کرتا دھرتاؤں سے بدلہ لینے کے لئے ڈاکو بن جاتا تھا۔ چنانچہ وہ قدم قدم پر خطرے جھیل کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ظالم جاگیرداروں، سوداگروں اور جب جاتا ہوا

کی دولت چھینتا تھا اور اپنے سب لوٹ [illegible] غریبوں کو دیتا تھا۔ بعد میں افسانہ نویسوں کی ذہانت نے اس کردار میں بھی تنوع پیدا کیا۔ چنانچہ یا تو ظفر عمر کی طرح کسی بے حد ذہین آدمی کو فوق الفطرۃ خوبیاں بخش کر چور بنا دیا جاتا ہے۔ یا کوئی خوش کردار مجرمانہ صلاحیتیں رکھتے ہوئے دوستوں کو خوش کرنے اور زندگی میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے شریف چور بن جاتا ہے۔ ایک اور روپ یہ بھی ہے کہ اچھے خاصے معزز شہری، جو کبھی تو ڈاکٹر ہوتے ہیں اور کبھی پولیس کے جنٹلمین، وقت آنے پر کبھی کبھی اپنی صلاحیتوں اور نئی قابلیت سے ایسے کام بننے کیلئے چور بن جاتے ہیں ——— مگر کئے ایک خاص حصے ہیں۔ ہر شخص کو عموماً اور ایک خاص طبقے کے باطن کو خصوصاً یہ کہانیاں بڑی پسند آتی ہیں۔ حق یہ ہے کہ قبولیت کی کئی باتیں ان کہانیوں میں بڑی کاوش سے سموئی جاتی ہیں ——— مثلاً ——— یہ ظاہر ہے کہ عام آدمی کو اونچے طبقے کے غرور و تمکنت، اور سرمایہ داری کی زبردستی سے بڑی کد ہوتی ہے چنانچہ مجرم ہیرو انہی کو لوٹتا دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اپنی اخلاقی حس کو بھی مطمئن کرنا ٹھہرا چنانچہ یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ یہی ڈاکو خدا ترسی اور محتاج نوازی میں زیادہ نہیں تو ہمارے آپ کے ولیوں کا ضرور ہم رتبہ ہے ——— اس پوزیشن سے مجرم ہیرو کا کردار جرم کی نفسیاتی بے اعتدالی سے بالا سمجھا جاتا ہے۔ اور پڑھنے والے اس میں ایک ایسے بہادر شہری کا عکس دیکھتے ہیں جس نے رواج اور قانون کی غلط پابندیوں اور اونچ نیچوں کے خلاف بغاوت کی۔ اور انقلاب کا جھنڈا بلند کیا۔ اس قسم کے کردار کی مقبولیت کا راز یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت کا ایک بڑا حصہ اس میں اپنی امنگوں اور اپنی حسرتوں کا عکس دیکھتا ہے۔ اور کسی نہ کسی طرح اس میں اپنے اس گمشدہ بھائی کا کھوج لگا لیتا ہے جس سے ہماری خدا شناسی اور اخلاق نوازی ہزاروں صدیاں پہلے جنت میں جدا ہوئی تھی ———

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے اسرار اور سراغ کی کہانیوں میں ایک نئی قسم کی کہانی کو رواج دیا ——— یہ غیر ملکی جاسوسوں اور قومی غداروں کی کہانیاں ہیں جو فوجی رازوں، اسلحہ کی خفیہ ساخت اور فوجوں کی نقل و حرکت کی ٹوہ میں رہتے ہیں یا اپنے آقاؤں کو ان سے بروقت خبردار کرتے ہیں اور دشمن کی جنگی کارروائیوں میں ہر طرح روڑے اٹکاتے ہیں۔ یہ کہانیاں جرمن جاسوسوں کے خلاف قومی جذبہ ابھارنے کے لئے شروع ہوئیں، پھر کچھ وارداتیں بھی سامنے آئیں۔ اور اس لڑائی کے دوران میں تو جرمنوں کی خفیہ جاسوسی ان کے ففتھ کالم اور ان کی بے اماں سرگرمیوں کو خیالی اور حقیقی مات دینے کی کہانیوں کا طوفان اٹھا۔ اور ہر قسم کے رطب و یابس کی بھرمار ہوئی ——— ان کہانیوں کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ ان کی دلچسپی کی ضامن صرف یہ بات ہوتی ہے کہ کس طرح غیر ملکی جاسوس یا ملکی غدار کو ہم وطنوں نے نیچا دکھایا، اس کی مکروہ سرگرمیوں کو ناکام بنا دیا۔ اور اس کی گھناؤنی شخصیت کو ضرر رساں کیڑے کی صفت بخش دیا گیا ——— مجرمانہ تخصص میں جنت والے "سانپ" کی علامت، شاید غیر ملکی جاسوس ہی کا کردار ہے!! ——— ——— ایک خاص حادثے نے لڑائی کا اعلان، جنت سے نکلنا۔ اس سے پہلے، وہ ہمارا دوست تھا۔ اس حادثے سے وہ ہمارے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس میں مقابلے کی ہمت نہ تھی اس لئے زمین پر رینگ کر کمین گاہ تلاش کرتا رہا تاکہ چھپ کر گھات میں بیٹھ کر ہمیں ایذا پہنچا سکے ——— چنانچہ درپردہ قومی جذبہ غیر ملکی جاسوس کے کردار کو گوارا بنا دیتا ہے۔ اس کی [illegible] اور غیر ملکی جاسوس کی ناکامی ایک وجہ سے ملکیت کے اس جذبے کو تحریک دیتی ہے، جو گروہ بندیوں اور قبیلہ سازیوں کی بدولت صدیوں پہلے ہم میں پیدا ہوا تھا۔

جرائم اور جاسوسی کی کہانیوں کی موٹی موٹی قسمیں بیان ہو چکی ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ کہانیاں سنجیدہ ادب میں کیا

رتبہ رکھتی ہیں۔

سنجیدہ ادب اور اس کے نقادوں نے ان کہانیوں کو ہمیشہ اپنی برادری سے خارج سمجھا ہے۔ اور انہیں سستا اور گھٹیا ادب گردانا ہے۔ جسے ادب کے مشینی دور نے بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار کی بدولت پیدا کیا۔ اور رواج دیا۔ یہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ مغربی ملکوں کے نیم خواندہ طبقے میں خصوصاً اس قسم کی کہانیوں کی ایک مستقل مانگ ہے۔ اسے پورا کرنے اور اس مانگ کو بڑھانے، پھیلانے کے لئے اشتہار بازی کی نئی نئی جدت طرازیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جاذب نظر عبارتوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ جرم و سراغ کی کہانیوں کی نت نئی سیریز چھاپی جاتی ہیں جن میں تازہ ترین واقعات، لباس اور تفریحوں کے نئے نئے فیشنوں اور طریقوں وغیرہ کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے چنانچہ لکھنے والوں کا ایک طبقہ پبلشروں کی سجھائی ہوئی بنیادوں پر پلاٹ کے گھڑنے میں کہانی کے رنگ بھرتا رہتا ہے۔ جو نکہ ان کہانیوں کی کتابیں بالکل ذہنی اصولوں پر مارکیٹ میں لائی جاتی ہیں۔ جن کے مطابق سستے طبقے یا ذہانتی عمل نیا۔ ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی آمدنی معقول ہوتی ہے۔ اس سے بعض دفعہ اچھے خاصے سنجیدہ ادیب بھی جدت کی بدولت اور گھٹیوں کے دام کے پیش نظر جرم و سراغ کی کوئی کہانی لکھ مارتے ہیں۔

ویسے ان کہانیوں میں اچھی اور بری (یعنی اچھی طرح سے لکھی ہوئی اور بری طرح سے لکھی ہوئی) کہانیوں کے ان گنت درجے ہیں۔ مگر ان تفریق اور امتیاز سے قطع نظر ان کہانیوں پر ایک بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ان میں پلاٹ پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اور "کہانی" کا عنصر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ "اظہار" اور "بیان" جو سنجیدہ کہانیوں میں آج کل زیادہ توجہ کے مستحق گردانے گئے ہیں زیادہ ابھر نہیں پاتے۔ اور موجودہ نقادوں کا خیال ہے کہ پلاٹ مصنف کی بے راہروی کا موجب بنتا ہے۔ اور چونکہ پڑھنے والے مصنف کی سی ذہانت اور فراست سے بہرہ ور نہیں ہوتے، اس لئے مصنف کو اپنی کہنے کے لئے اس کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے تاکہ لوگ اس کی بات سمجھیں۔

کچھ بھی ہو تمدن اور تہذیب کی صدیاں کھا چکنے کے بعد اب بھی انسان کو کہانیاں سننے میں مزا آتا ہے۔ اور اسی تمام رہنے والی دلچسپی نے جرائم اور جاسوسی کی کہانیوں کو زندہ رکھا ہے۔ نقاد، مصنف، خوش ذوق قاری، فلسفی اور سیاستدان انہیں فرار اور وقت گزارنے کا مشغلہ جانتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں کہانی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور کہانی بھی انسانی فطرت کے اس پہلو سے تعلق رکھتی ہے جس میں ہر انسان دلچسپی لینے پر مجبور ہے کیونکہ ہر شخص کی فطرت جرم کے خفتہ یا بیدار عنصر سے خالی نہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ انگریزی کے سنسنی خیز ناولوں سے جاسوسی ناولوں کو اس لئے گھٹیا سمجھیں کہ یہ اردو میں لکھے گئے ہیں اور اس لئے بھی کہ یہ کسی جرم کی کہانی بیان کرتے ہیں جہاں قتل ایک بڑی سیدھی چیز ہے۔ چوری اور ڈاکہ بھی اسی انداز سے پر سرانجام پاتا ہے۔ اور باقی خیر سلا ہے۔

سہیل عظیم آبادی

صدیقہ بیگم کے افسانے

اردو ادب کے لئے اب نہ تو صدیقہ بیگم اجنبی ہیں اور نہ ان کے افسانے

صدیقہ بیگم کا شمار اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں ہے اور افسانہ نگار خواتین کی صف میں تو وہ بہت ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ نظر میں وسعت، فکر میں پختگی، عام انسانی ہمدردی اور ذوق کی بلندی کی مثال جو ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ وہ ڈاکٹر رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے علاوہ کسی اور خاتون کے افسانوں میں نہیں ملتی اور جہاں تک موضوع میں تنوع کا تعلق ہے۔ وہ کسی افسانہ نگار خاتون سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ موضوع کے تنوع کے لحاظ سے دوسری تمام افسانہ نگار خواتین سے وہ آگے ہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ ان کی ادبی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ پھر بھی جو شہرت مقبولیت اور وقعت انہوں نے حاصل کر لی ہے کہ وہ قابل ستائش اور قابل رشک بھی۔

صدیقہ بیگم اپنے خیالات اور تصورات کے لحاظ سے ترقی پسندوں میں ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں بھی ان کا تعلق آخری ٹولی سے ہے۔ آخری ٹولی سے میری مراد ان افسانہ نگاروں سے ہے جو سن ۱۹۴۰ء کے بعد ابھرے یعنی ان کی افسانہ نگاری کی عمر زیادہ نہیں۔ لیکن ان کے افسانوں میں احساس، شعور اور فن کی پختگی کی کمی نہیں۔ معمولی سے معمولی واقعہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر واقعہ کو اس مہارت کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور جو اثر پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ کامیابی کے ساتھ کر لیتی ہیں اور معمولی واقعات کو سلیقے کے ساتھ مرتب کر کے ایک خوشنما افسانہ مرتب کر لیتی ہیں۔ پھر بڑی سادگی کے ساتھ واقعہ کو بیان کر کے کسی بڑے نتیجہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کر جانا ان کا بڑا کمال ہے۔

صدیقہ بیگم کی افسانہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے کچھ دنوں تک لکھتے رہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئیں ان کے شروع دور کے افسانوں میں عام افسانہ نگاروں کی طرح جذباتیت، رنگینی بلاٹ اور شاعرانہ لطافت ہے۔ لیکن زندگی کی حلاوتیں بہت کم ہیں۔ زندگی رنگینیٔ بیان اور جذباتیت میں کھو کر رہ جاتی ہے چنانچہ ان کے پہلے مجموعہ "ہچکیاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے شروع دور کے افسانوں کے متعلق پروفیسر احتشام حسین نے اپنی ریڈیائی تقریر میں کہا تھا:-

"رنگینی بیان ہے، لطافت ہے، زبان کا لوچ ہے، جذبات نگاری ہے۔ لیکن کوئی طاقت نہیں۔"

شاید ان کی خاموشی ان کی افسانہ نگاری کے حق میں مفید ہوئی۔ اس وقفہ میں انہیں سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور جب دوبارہ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں میں زندگی کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ "ہچکیاں" میں بعض ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن میں زندگی اپنی پوری تڑپ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسی تقریر میں پروفیسر احتشام کو یہ بھی کہنا پڑتا ہے:-

"۔ ۔ ۔ جب وہ راستہ صاف ہو گیا جس پر وہ گزر رہی تھیں۔ سنہ [illegible] سے ۴۳ء تک انہوں نے چند بے مثل افسانے لکھے۔ ایسے افسانے جو پرخلوص انداز بیان، مواد اور اظہار کی ہم آہنگی کے سبب غیر معمولی طاقت رکھتے ہیں"

یعنی آگے چل کر صدیقہ بیگم کا احساس تیز اور نقطہ نظر وسیع ہوتا گیا۔ ان کا فن برابر ترقی کرتا رہا اس میں کہیں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ اور جب بنگال میں چند سرمایہ داروں کی مجرمانہ سازش سے قحط پڑا۔ چاول سونے کے مول ہو گیا۔ سرمایہ داروں کی تجوریاں بھریں اور لاکھوں نے بھوک سے تڑپ تڑپ کر جانیں دیں۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے۔ ماؤں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کا ساتھ چھوڑا۔ کنواریوں نے کوڑیوں کے دام اپنی عصمتیں بیچیں۔ دودھ پیتے بچوں نے فاقہ زدہ ماؤں کی سوکھی چھاتیوں سے دودھ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آخری سانسیں لیں۔ —— اور یہ سب صدیقہ بیگم نے دیکھا اور سنا تو ان کے احساس کو سخت جھٹکا لگا۔ زندگی اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کی نظر کے سامنے آگئی۔ ان کے بیان میں زیادہ زور پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے۔ کہ بنگال کا قحط ان کے رجحانات، تصورات اور فن موڑ ہے۔ اور اسی قحط کے بعد انہوں نے جو افسانے لکھے ان کو دیکھ کر پروفیسر احتشام حسین کو کہنا پڑا —— "بنگال کی بھوک نے ان کے افسانوں میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی، ان کے خلوص کا بہاؤ تیز کر دیا۔ ان کے بیان کا زور بڑھا دیا۔ ان کے فن کو زندگی سے ہم آغوش کر دیا۔"

ایسی منزلیں ہر فن کار کی راہ میں آتی ہیں۔ اور ہر فن کار کا فن رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ بڑی مشق کے بعد قلب و دماغ میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کار کا تصور اور اس کا فن واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اگر صدیقہ بیگم کے شروع دور کے افسانوں میں زندگی کی تڑپ نظر نہیں آتی تو تعجب کی بات نہیں۔ پھر بھی اتنی بات ضرور ہے کہ انہوں نے اپنی افسانہ نگاری جہاں سے شروع کی وہاں سے پیچھے نہیں ہٹیں۔ ان کا ذہن ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا گیا اور اب وہ ایک مخصوص فلسفہ حیات کی قائل نظر آتی ہیں۔ ان کی منزل متعین ہے۔ اسی لئے ان کا ہر نیا افسانہ پہلے سے زیادہ اچھا اور زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ اور یہ کسی مصنف کے لئے بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔

"ہچکیاں" کی اشاعت کو کئی برس گزر گئے۔ اس مدت میں دنیا نے بہت سی کروٹیں لیں۔ دوسری جنگ عظیم لڑی گئی۔ اور فاشیت کی شکست پر ختم ہوئی۔ ہندوستان آزاد ہو گیا، اگرچہ سامراج کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے ہندوستانیوں کو وہ آزادی نہیں ملی جس کا خواب ہم دیکھ رہے تھے۔ چلتے چلتے انگریزی سامراج نے ملک کے ٹکڑے کر دیئے تاکہ متحد اور آزاد ہندوستان اس کے منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ ہند اور پاکستان کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی اور ملک کے اندر کی رجعت پسند طاقتوں نے سامراج کے مقاصد میں کچھ اس طرح اسکا ہاتھ بٹایا کہ سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لاکھوں بے گناہ زندگیاں ہنگاموں کی نذر ہو گئیں۔ چند سیاسی بازیگروں نے سامراج کی اشارہ پر یہ سب کچھ کیا اور اپنے ہاتھوں ملک کا ستیاناس کر دیا جو سامراج جب تک یہیں رہ کر اسکے مقاصد کی پرورش تہذیب باز گیر اب بھی ملک کے دونوں حصے عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجودہ انتشار و پراگندگی کی تصویر کشی کر کے ہر شریف دل رکھنے والے انسان کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ وقت کے لحاظ سے موضوع پر افسانے لکھنے والوں میں کرشن چندر کے بعد صدیقہ بیگم ہی کا نام آتا ہے بہت سے مواقع پر جب ہمارے دوسرے فن کار خاموش رہے ہیں تو کرشن چندر نے ان کی رہنمائی کی ہے۔ اور وقت کی ضرورت پوری کی ہے۔ اپنی پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ۔ اس لحاظ سے صدیقہ بیگم کی خدمات بھی نہیں بھلائی جا سکتیں۔ انہوں نے بھی ہمیشہ وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ اور جب بھی لکھا ہے۔ تو پورے جوش کے ساتھ۔

اب صدیقہ بیگم کے افسانوں میں ہمیں زندگی کے متعلق ایک واضح تصور کی طرف صاف اشارے ملتے ہیں۔ گرچہ یہ اشارے بہت ہی لطیف ہوتے ہیں تشبیہوں اور استعاروں میں لیکن ہمیں یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اشتراکی ہے۔ وہ سارے انتشار اور کشمکش کا علاج اشتراکی نظام کے قیام کو سمجھتی ہیں۔ اور یہ درست بھی ہے۔ ہماری سماجی زندگی میں جس قسم کے مدارج اور غیر متوازی حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے لئے اشتراکی نظام کے قیام کے علاوہ کوئی دوسری صورت بھی نہیں ہے۔ لیکن اشتراکیت کی تبلیغ کے لئے وہ اپنے افسانوں میں کھوکھلی نعرہ بازی سے کام نہیں لیتیں۔ فن کو پروپیگنڈے پر قربان نہیں کرتیں۔ وہ افسانہ کی فنی نزاکتوں کا ہمیشہ لحاظ رکھتی ہیں۔ وہ اب سماج میں اصلاح کی قائل نہیں۔ ان کے خیال میں اس سماج کی بنیاد سے لے کر پوری عمارت اتنی کھوکھلی اور فرسودہ ہو چکی ہے کہ اسے ڈھا کر از سرِ نو اشتراکی بنیادوں پر نئی تعمیر کی ضرورت ہے۔

افسانوں کے موضوع کے لحاظ سے صدیقہ بیگم کا دماغ بہت ہی زرخیز ہے۔ وہ کسی خاص موضوع کی پابند نہیں۔ ان کی نگاہ میں بڑی وسعت ہے۔ اور مشاہدے کی کمی نہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد تلاش کرنے کے لئے شہد کی مکھی کی طرح محنت کرتی ہیں۔ کبھی کالج کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں، کبھی مزدوروں کی بستی میں، کبھی کسانوں کی جھونپڑوں میں، کبھی ریلوے اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ میں، کبھی ریل کے ڈبوں میں، کبھی اشتراکی نوجوانوں کی ٹولی میں، کبھی بنگال کے قحط زدہ علاقوں میں، کبھی دہلی کے فساد زدہ محلوں میں، کبھی متوسط گھرانوں کی کچلی ہوئی جوان لڑکیوں میں — وہ ہر جگہ سیر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور ہر جگہ سے اپنے افسانوں کے لئے مواد حاصل کر لیتی ہیں۔ اور ان کا قلم کسی جگہ کی تصویر کشی میں لغزش نہیں کرتا۔ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ ان کی تصویر وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کاغذ پر اتار دیتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی خاص موضوع پر تو وہ بہت اچھا لکھتی ہوں اور دوسرے موضوع پر لکھتے وقت ان کا رنگ پھیکا ہو۔

لیکن صدیقہ بیگم کا قلم متوسط گھرانوں کی چار دیواری کے اندر بند عورتوں اور جوان لڑکیوں کی جب تصویر کشی کرتا ہے۔ تو اپنی پوری جولانی دکھاتا ہے متوسط گھرانوں کا گھٹا گھٹا ماحول آمدنی کم اور اخراجات زیادہ۔ ان کی اوپر چڑھنے کی خواہش ان کے حوصلے ان کی مجبوریاں ان کے توہمات، خاص خاص خیالات اور خاص کر اس ماحول میں پرورش پانے والی جوان لڑکیوں کی دلی کیفیات، ان کے جذبات۔ ایک طرف بڑی بوڑھیوں کی کڑی نگرانی۔ دوسری طرف کالج میں پڑھنے والے بھائیوں کے ساتھ آزاد خیالی کی آئی ہوئی رو۔ ان خیالات سے مرتب ہونے والے اثرات، جذبات میں کشمکش بغاوت کا جذبہ، مجبوری، بوجھل جذبات میں پراگندگی اور انتشار اور ان کی بے بسی — ایسے موقعوں پر صدیقہ بیگم ان لڑکیوں کے ساتھ جس ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں، وہ ان کا حصہ ہے۔ ان کی یہ ہمدردی انہیں موجودہ زمانہ کے متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کا وکیل بنا دیتی ہے — اور کبھی کبھی تو شدت احساس سے مغلوب ہو کر وہ اپنے افسانوں کے کرداروں سے اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ اپنے افسانوں کا خود ایک کردار بن جاتی ہیں۔ اور پڑھنے والے کے لئے ان کی ذات کو افسانہ سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے — بعض نقاد اسے ان کی کمزوری کہہ سکتے ہیں لیکن خلوص اور شدت احساس کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس طرح عوامی رہنما کبھی کبھی عوام میں چھپ جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی حساس فنکار بھی اگر اپنی ذہنی تخلیقات میں گھل مل جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

صدیقہ بیگم اپنے افسانوں کے لئے پلاٹ نہیں بناتیں، خاص اہتمام نہیں کرتیں، لمبی چوڑی تمہیدوں سے کام نہیں لیتیں، اشتیاق پیدا کرنے کے لئے الجھن پیدا نہیں کرتیں، بلکہ کوئی سیدھا سادہ واقعہ جو ان کی نظر کے سامنے سے گزرتا ہے۔ اسے فنکارانہ صلاحیتوں کے

ساتھ جوں کا توں کاغذ پر اتار کر رکھ دیتی ہیں جس سے وہی سارے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں جو وہ چاہتی ہیں۔ چنانچہ متوسط گھرانوں کی منتشر و پریشان زندگی کی بہت سی کامیاب تصویریں انہوں نے اتاری ہیں جن میں ان گھرانوں کی ہر ایک چیز منتشر نظر آتی ہے۔ ان گھرانوں میں نوجوان لڑکے کس طرح بھٹکتے ہیں۔ لڑکیاں کس طرح کچلی جاتی ہیں۔ ان کے خلاق تصورات کس طرح متزلزل ہوتے ہیں یہ لوگ کن ہاتھوں میں پرعمل کرتے ہیں۔ ان کی نکمتی، ان کی زندگی میں کس قدر تضاد ہوتا ہے۔ گھروں کے بڈھے بڈھے کس طرح ہر بات پر پچاس سال پہلے کے زمانے کو یاد کرتے ہیں۔ اور جوانوں کو طعنے دیتے ہیں۔ اور اس وقت یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ پچاس سال پہلے وہ بھی اسی طرح آزادی آزادی پسند تھے۔ اور یہی طعنے سن کر جوان اور پھر بڈھے ہوئے۔ صدیقہ بیگم نے متوسط گھرانوں کے مختلف افراد کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی بڑی کامیاب تصویریں کھینچی ہیں لیکن اس کا مطلب نہیں کہ دوسرے موضوع پر بھی لکھتی ہیں۔ سوچ سمجھ کر لکھتی ہیں۔ اور خوب لکھتی ہیں۔

صدیقہ بیگم کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں، اور ابتدائی دس سال وہیں گزرے پھر وہ سیوہارہ چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد وہ علی گڑھ چلی آئیں، جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی اور وہیں سے انہیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ وہ خود اعتراف کرتی ہیں "علی گڑھ میں رشید آپا سے ملاقات ہوئی ان سے بہت کچھ سیکھا"۔ یہ جان لینے کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ ان کی زبان اتنی لطیف اور اتنی واکیوں ہے۔ ان کے خیالات اس قدر صاف کیوں ہیں۔ یہ لکھنؤ کی ابتدائی زندگی اور ڈاکٹر رشید جہاں کی صحبت کا اثر ہے۔

ان کے افسانے پڑھنے کے بعد آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ صدیقہ بیگم کے سینے میں ایک سچے فنکار کی مضطرب، اور بے چین روح کام کرتی ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں ان کی جو کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی کسی نہ کسی مقبول رسالے میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اس لئے ان پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔ البتہ کہانیوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ "ہچکیاں" سے اب وہ بہت آگے جا چکی ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی ان کے بہت ہی تازہ افسانے نہیں بلکہ اکثر کو لکھے ہوئے چار پانچ سال گزر چکے ہیں اور ان چار برسوں میں صدیقہ بیگم بہت سی منزلیں طے کر چکی ہیں اور آج ان کا دماغ اور فن جس سطح پر ہے۔ اُسے یہ افسانے صحیح طور پر نہیں بتا سکتے۔

ادھر جو چند افسانے ان کے شائع ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد ان کے شعور اور فن کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ بھی انہوں نے لکھا ہے، وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ چنانچہ ان کے تازہ افسانوں میں بہت ہی باریک بینی اور نزاکت و جزئیات نگاری کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ واقعات نگاری میں انہوں نے انہیں چیزوں کو لیا ہے۔ جو افسانے کی تعمیر میں حسن پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں غیر ضروری جزئیات سے احتراز کیا ہے یعنی انہوں نے فن کا مقصد سمجھا ہے۔ اور اسے برتنا بھی جانتی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض تفریح طبع اور وقت گزارنے کے لئے نہیں — بلکہ اس لئے لکھا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ اس لئے لکھا ہے۔ کہ ان کا فن نئے سماج کی نئی تشکیل میں معاون ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے فن پر کوئی ضرب نہیں آنے دی۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں کسی مصلح کی خشک تقریریں نہیں۔ سیاسی کارکنوں کی ہنگامی نعرہ بازی نہیں — کسی تحریک چلانے والے کی ہنگامہ پروری نہیں بلکہ ان کے فن میں ایک مخلص اور سچے فنکار کی بے چین روح تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے — "پلکوں میں آنسو" کے افسانوں میں کہیں کہیں برساتی ندی کا تیز بہاؤ ملتا ہے۔ لیکن صدیقہ بیگم کے تازہ ترین افسانوں میں یہ بہاؤ نہیں رہا۔ اب ان کے فن میں ٹھہراؤ اور وسیع سمندر کا سکون پیدا ہو چلا ہے۔

جس میں کبھی کبھار جوار بھاٹا کی کیفیتیں پیدا ہو کر ان کے فن میں حسن پیدا کر دیتی ہیں۔

صدیقہ بیگم مخلص، حساس اور ذی شعور فنکار ہیں ـــ اور بقول پروفیسر احتشام حسین "اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ کس طرح ایک خاص واقعہ کسی فنکار کے ذہن میں مرتسم ہو سکتا ہے تو اسے صدیقہ بیگم کے افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہیے"۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صدیقہ بیگم کا فن اب تک اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچا، وہ برابر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے اور ہمیں آئندہ دیکھنا ہے کہ آخر اس مصنفہ کی آخری منزل کہاں ہوتی ہے۔

خاطر غزنوی

لڑکھڑاتی ہوئی ذہنیتیں تاریک شعور
شوقِ تسخیر دماغوں میں ابھی زندہ ہے   دل میں تخریبی تجسّس ابھی تابندہ ہے

•

جنتیں آگ کے شعلوں کی فصیلوں میں اسیر
زندگی خون کے طوفانوں میں کرلاتی ہوئی   موت ہر گام پہ پھنکارتی منڈلاتی ہوئی

•

شوکتی گولیاں غراتے ہوئے بھاری ٹینک
جھنجھناتے ہوئے طیارے، برستے ہوئے بم   اپنے ہی واسطے انساں نے تراشے ہیں ستم

•

اور پھر اپنے ہی زخموں کے مداوے کے لئے
جھلملاتے ہوئے ایوان سجا رکھے ہیں   چند لچکیلے سے قانون بنا رکھے ہیں

•

زندگی جب کہیں ہو جاتی ہے شعلوں میں اسیر
سب یہاں سوچتے ہی سوچتے رہ جاتے ہیں   مشورے خون کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں

•

رات بھر جلتے رہیں گر یونہی سوچوں کے چراغ
راکھ ہو جائیں گے پروانے سحر ہونے تک   "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

•

ناصر شمسی

لکشمی آئے بعد

افراد

مہابیر پرشاد	
بملا	اُن کی بیوی
کیلاش	اُن کا لڑکا
کمل پرشاد	اُن کے دوست
کلیانی	اُن کی منہ بولی بہن
سادھنا	کلیانی کی لڑکی
نتھو	ایک کسان
گوپی ناتھ	راج منڈلی کے زمیندار کے منیم
راجندر پرشاد	زمیندار جی کے دوست
نوکر	

راج منڈلی

ایک چھوٹا سا مکان جس کا کچھ حصہ کچا ہے اور کچھ پکا۔ آگے چھپر پڑا ہے۔

اسی مکان کا ایک کمرہ۔ کمرہ چھوٹا ہے اور چھت نیچی۔ دیوار پر مٹی کا پلستر ہے جو کہیں کہیں سے جھڑ گیا ہے سفیدی پھیکی پڑ چکی ہے۔ پیچھے کی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس میں سلاخوں کی جگہ بانس لگے ہوئے ہیں۔ کھڑکی کے پٹ سادے اور معمولی ہیں اور استعمال سے زیادہ حصہ سے رنگ اڑ گیا ہے۔ کھڑکی سے کچھ دور دروازہ ہے۔ یہ دروازہ باہر برآمدہ میں کھلتا ہے۔ برآمدہ کا نیچا سا چھپر کمرے میں سے نظر آتا ہے۔ برآمدہ کمرے سے ایک سیڑھی نیچا ہے۔ برآمدے کے آگے آنگن ہے۔ جس کو ایک نیچی سی منڈیر گھیرے ہوئے ہے۔ اس منڈیر میں بانس کی پھٹیاں کی ہوئی ہیں جن پر سبزیوں کی ایک دو بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ برآمدہ، آنگن، منڈیر اور

بیلیں پیچھے کے دروازہ میں نظر آ رہی ہیں۔ دروازہ اور کھڑکی کے بیچوں بیچ کھونٹی ہے جس پر ایک چادر اور ٹوپی لٹکی ہوئی ہے۔ نیچے ایک چھتری رکھی ہے۔ دائیں طرف اندر جانے کا دروازہ ہے۔ دروازہ کے پاس ایک الماری ہے جس میں کتابیں رکھی ہیں۔ الماری کے اوپر ضرورت کی کچھ چیزیں رکھی ہیں (لالٹین وغیرہ) بائیں طرف الگنی بندھی ہوئی ہے جس پر کچھ دھوتیاں اور بچوں کے کپڑے جھول رہے ہیں۔ کمرے میں ایک نیچا سا تخت بچھا ہوا ہے اور ایک کرسی بھی رکھی ہوئی ہے۔

مہابیر پرشاد تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کپڑے موٹے اور سادہ ہیں۔ لیکن اجلے ہیں۔ مہابیر پرشاد کی عمر اڑتیس سال ہے۔ چہرے کی سختی سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر تنگی میں بیتی ہے۔ لیکن چہرے کا وقار ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ تنگی نے خودداری کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ کچھ اور بڑھا ہی دیا ہے۔ مہابیر پرشاد کو اپنی غریبی پر فخر ہے

مہابیر پرشاد کے پاس ان کا بڑا لڑکا کیلاش بیٹھا ہے۔ عمر ۱۲ سال ہوگی۔ چہرہ سے ذہانت ٹپکتی ہے اور باپ کے وقار کی ایک جھلک بیٹے میں بھی پائی جاتی ہے۔

بملا (دائیں جانب سے آواز) اجی۔ میں نے کہا... ذرا سنو تو...

مہابیر (جلدی سے) بیٹا کیلاش۔ اچھا اب تم تھوڑی دیر باہر جا کر کھیلو۔ پڑھتے کافی وقت ہو گیا ہے۔ میں کچھ دیر بعد آواز دے لوں گا۔ ہاں!

کیلاش۔ اچھا پتا جی (کتابیں بند کر کے پیچھے کے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

بملا اندر آتی ہے۔ عمر ۳۰ سال ہے۔ لیکن جب سے تنگی اور سختی میں بیتے تو کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ کام اور بیچ فکریں کام سے زیادہ۔ ناکافی خوراک اور آرام کم یہ بملا کا نیم ہے۔ اس سے بھی کوئی کام کرتے کرتے اٹھ کر آتی ہے اور کوئی فکر سر پر سوار ہے

بملا۔ اجی۔ میں نے کہا...

مہابیر۔ میں جانتا ہوں۔ تمہیں کیا کہنا ہے اور وہ کونسا دن ہوتا ہے جو تم آ کر میرا سر نہ کھاتی ہو۔ لیکن بملا تم ہی سوچو۔ روز روز کہنے سے کیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں۔ گھر میں کبھی آٹا نہیں ہوتا کبھی دال نہیں ہوتی۔ کبھی اس چیز کی ضرورت ہے۔ یہ چیز مل گئی تو کچھ اور چاہیئے۔ میرے پاس ان سب باتوں کا کوئی جواب نہیں.... تم ہی بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں

بملا۔ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اس سمے یہی کہنے آئی تھی؟

مہابیر۔ اچھا؟ (ہنستا ہے) تو آج بہت اچھا دن ہے

بملا۔ مجھے آتا دیکھ کر تم نے کیلاش کو باہر کیوں بھیج دیا؟

مہابیر۔ میں نہیں چاہتا کہ گرہستی کی ایسی باتیں وہ سنے۔

بملا۔ میں کب اس کے سامنے ایسی باتیں کرتی ہوں

مہابیر۔ کرنی بھی نہیں چاہئے۔ کیلاش ابھی بچہ ہے۔ ابھی سے جو اس کے کان میں ایسی باتیں پڑیں گی تو غریبی سے ابھی سے ڈرنے لگے گا... میں چاہتا ہوں کہ ابھی اس کا سارا دھیان پڑھائی میں رہے... میں چاہتا ہوں۔ آپ

میں اتنی شکتی پیدا ہو جائے کہ دھن کا بوجھ اس کے من کو خراب نہ کر سکے۔
بملا۔ میں کب اس سے کہتی ہوں کہ آٹے دال کا حساب رکھے!
مہابیر۔ تو اتنا غصہ کیوں ہو رہی ہو؟
بملا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اس کے سوا کوئی دوسری بات ہی نہیں کرتی۔
مہابیر۔ یہ میری بھول ہے۔ بس!
بملا۔ میں تم سے اگر چار پیسہ مانگتی ہوں تو اپنے لئے تو نہیں.... تمہارے انہیں بچوں کے لئے مانگتی ہوں۔ انہیں پینے کے لئے دودھ نہیں ملتا۔ گھر میں گائے بھینس نہیں کہ دہی مکھن ہی ہو جائے.... اناج بھی کبھی ملتا ہے اور کبھی وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتا.... تم ہی دیکھو۔ اس ساری راج منڈلی میں کسی اور کے گھر بھی یہ بپتا ہے
مہابیر۔ میں اپنے گھر کا دکھ دیکھنے کسی دوسرے کے گھر نہیں جاتا!
بملا۔ اور اپنے گھر کا دکھ تمہیں نظر نہیں آتا۔
مہابیر۔ مجھے سب کچھ نظر آتا ہے۔
بملا۔ میں کیا جانوں نظر آتا ہے کہ نہیں.... میرے ہاتھ میں تو تم وہ ہی گنتی کے پیسے دیتے ہو!
مہابیر۔ بملا۔ اس دیش میں ایک آدمی کی ایک دن کی آمدنی چھ پیسہ ہے۔
بملا۔ تو میں کیا کروں۔ ہوا کرے۔
مہابیر۔ یہ بات دواہ سے پہلے میں نے تمہارے پتاجی کے کان میں ڈال دی تھی۔ تمہیں اس سے پہلے زیادہ پیسہ مانگنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔
بملا۔ میرا کیا ہے میں تو چھ کوڑیاں بھی نہ مانگوں۔ لیکن تم، تمہارے دو لڑکے، کیلاش، پرکاش، تمہاری لڑکی شاما، چاروں کے لئے چھ آنے روز چاہئیں۔ مجھ سے یہ بپتا نہیں دیکھی جاتی کہ میرے بچے، میرے سوامی...
مہابیر (بات کاٹ کر) میری بات چھوڑ دو!
بملا۔ کیوں؟
مہابیر۔ میں بڑے سکھ سے ہوں
بملا۔ کیا سکھ ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔
مہابیر۔ تم جانتی تو ہو۔ یہ پاٹھ شالہ میرا جیون ہے۔ راج منڈلی کے لڑکے لڑکیوں کو پڑھا کر مجھے بہت شانتی ہوتی ہے
بملا۔ یہ تو تم مجھے کتنی ہی بار بتا چکے ہو!
مہابیر۔ میری بڑی خواہش ہے کہ یہ پاٹھ شالہ راج منڈلی کو گیان کی شکتی دے
بملا۔ میری تو سمجھ میں تمہاری یہ باتیں آتی نہیں
مہابیر۔ لیکن بملا، استری کا سب سے بڑا گن یہ ہے کہ سوامی کے من کو سمجھے اور اس کی آگیا کا پالن کرے۔
بملا۔ میں کب کہتی ہوں مجھ میں کوئی گن ہے۔
مہابیر۔ اچھا بابا اچھا!.... اب میرا پیچھا چھوڑو!

بملا۔ میں تو خود جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ (چلی جاتی ہے۔ پھر لوٹ کر آتی ہے) اور ہاں میں جو بات کہنے آئی تھی۔ وہ تو بھول ہی گئی۔

مہابیر۔ اچھا وہ بھی کہہ ڈالو!

بملا۔ میں زمیندار ٹھاکر داس کے ہاں دعوت میں نہیں جاؤں گی! سن لو! (واپس جانے لگتی ہے)

مہابیر (روکتے ہوئے) لیکن ذرا سنو تو۔ ۔ ۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔

بملا۔ تم جاؤ۔ اپنی لڑکی لڑکوں کو لے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔

مہابیر (ہنس کر) یاد آیا۔ زمیندار جی نے تمہارا اپمان کیا تھا۔ اس لئے!

(بملا خاموش رہتی ہے)

مہابیر۔ اچھا بملا۔ اگر زمیندار جی نے تمہیں اونچی جگہ سے اٹھوا کر نیچی جگہ بٹھا دیا تو اس میں ایسا کیا اپمان ہو گیا؟

بملا۔ تمہارے لئے تو جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہے!

مہابیر۔ میرے لئے تو اونچی اور نیچی دھرتی کی سب جگہ ایک سمان ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دکھی نہیں ہونا چاہئے بملا!

بملا۔ ہم غریب ہیں تو اپنے گھر کے۔ زمیندار جی امیر ہیں تو اپنے گھر کے۔ وہ اپنا سکھ کچھ ہمیں نہیں دے جاتے اور ہم کونسا اپنا دکھ ان کے سر جا ڈالتے ہیں۔ جب پرماتما نے ہمیں اپنے گھر کھانے کو دیا ہے تو ہمیں ایسی کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان کے ہاں جوتیوں میں بیٹھ کر کھائیں۔

مہابیر۔ لیکن بملا۔ ۔ ۔ ۔

بملا (بات کاٹ کر) میں نے کہہ دیا میں نہیں جاؤں گی۔ زمیندار جی زیور کو دیکھ کر کھانا کھلاتے ہیں۔ میرے پاس اتنا زیور نہیں کہ گوندھنی کی طرح لد جاؤں۔

مہابیر۔ اچھا! اچھا!! ۔ ۔ ۔ مت جاؤ۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ غریبی کوئی لاج کی بات نہیں ہے۔ غریب کو اگر کوئی غریب کہے تو اپمان نہیں ہوتا۔

بملا۔ اپمان ہوا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ بس میں نے کہہ دیا۔

(بملا تیزی سے چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے آواز آتی ہے)

نتھو (آواز) بابو جی! ۔ ۔ ۔ ۔ بابو جی!!

مہابیر۔ کون؟ نتھو! آؤ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ اندر آؤ۔

(نتھو داخل ہوتا ہے۔ عمر چالیس سال ہو گی۔ ایک معمولی کسان ہے۔ ایک میلی سی دھوتی بندھی ہوئی ہے اور کسی موٹے کپڑے کا ایک کرتہ پہنے ہوئے ہے۔ کرتہ کا گریبان پھٹا ہوا ہے اور سینہ پر ٹھوکر کی چوٹ ہے جس میں سے تھوڑا سا خون بھی نکلا ہے۔ کپڑے مٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔ نتھو رو رہا ہے)

نتھو (گریبان کھول کر دکھاتے ہوئے) بابو جی دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ لو دیکھو!

مہابیر۔ ارے یہ تیرے سینہ پر خون کیسا لگا ہے؟

ننھو - بابوجی. لاتیں ہی لاتیں ماری ہیں میرے سینے پر۔ خون بھی نکل آیا!

مہابیر۔ ماری کس نے ہیں لاتیں ؟

ننھو - اور کون مار سکتا ہے بابوجی! . . . . وہ ہے نا زمیندار جی کا مکھیا ر (مختار) بیگار میں پکڑے لے جانے تھے۔ مجھے اپنا ڈھیروں کام کرنا تھا۔ اب بابوجی بولو۔ میں اپنا کلج کروں یا اس کی بیگار۔ میں نے کھنی کھو شامد (خوشامد) کی۔ میں نے ہاتھ جوڑے . . . . بس بابوجی، ہاتھ جوڑنے تھے کہ وہ تو پل پڑا۔ ہاتھ لات جہاں پڑی مارے گیا۔ بہت مارا ہے بابوجی . . . . لو دیکھو! . . . لو دیکھو!!

مہابیر۔ ہاتھ کیوں جوڑے تھے۔

ننھو - تو بابوجی یہ کوئی بری بات تو نہ تھی جو مار پڑتی !!

مہابیر۔ ہاتھ جوڑنے بری بات ہے ننھو!

ننھو - لیکن بابوجی میں نے ایسا کیا کسور (قصور) کیا تھا جو مجھے اتنی مار ماری ہے ؟

مہابیر۔ زمینداری میں رہنا ہے تو مار کھانی پڑے گی۔

ننھو - واہ بابوجی! زمینداری کا مجھ پر کچھ نکلے ہے جو مار کھاؤں ہیں ؟ میں تو زمیندار جی کو دیوالی دسہرہ پر بھینٹ بھی دیتا ہوں فصل ہو تو ناج بھی دیتا ہوں۔ کھالی (خالی) ہووے ہوں تو بیگار بھی کھوسی کھوسی (خوشی) دیوے ہوں . . . یہ تو انیائے ہے بابوجی!

مہابیر۔ ہاں۔ انیائے ہے ۔ اور اگر تجھے نیائے کا کچھ خیال ہوتا تو تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوتے ۔ روتا وہ ہے ۔ وہ جو کچھ کر نہیں سکتا۔

ننھو (آنسو پونچھ لیتا ہے) لو بابوجی ! . . . . . اب تم میری آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھو گے ۔ میں نیائے چاہتا ہوں

مہابیر - تو پھر فوجداری کی ایک نالش کر دے !

ننھو - نالش ! ناہی بابوجی ! کھرچ (خرچ) تو میرے پلے ہے ناہی !

مہابیر۔ اس کا انتظام میں کرتا ہوں ! (بملا کو آواز دیتا ہے) اجی . . . . ذرا سنو تو۔

(بملا آتی ہے)

بملا۔ مجھے آواز دی ہے ؟

مہابیر۔ ہاں ! ننھو کے پاس نالش کے لئے خرچ نہیں ہے . . . .

بملا - (بات کاٹ کر) تو مجھ سے کیا کہتے ہو ؟ میرے پاس کیا دھرا ہے جو میں دے دوں۔ صرف دو دو چوڑیاں اور ایک ایک بالی رہ گئی ہے ۔ یہ بھی لے لوگے تو میرے پاس کیا رہے گا . . . میں اب اور کچھ نہیں دوں گی۔

(چلی جاتی ہے تیزی سے)

مہابیر (کچھ دیر وچار کے بعد) اچھا دیکھو ننھو ! مہیشور پرشاد وکیل ہیں نا . . . . وہ میرے متر ہیں۔ ہم دونوں نے ساتھ وکالت پڑھی تھی۔ میں ان کے نام ایک چٹھی لکھ دیتا ہوں تو ان کے پاس چلا جا۔ وہ بغیر خرچ لئے کام کر دیں گے۔

ننھو۔ اچھی بات ہے بابوجی!

مہابیر (چھٹی لکھ کر دیتا ہے) یہ لو چٹھی!
نتھو۔ (چٹھی لیتا ہے) بھگوان تمہارا بھلا کرے (جانے کے لئے واپس مڑتا ہے)
مہابیر۔ نتھو!
نتھو (پلٹ کر آتا ہے) جی بابوجی!
مہابیر۔ زمیندار جی کا غصہ تم جانتے ہو۔ ۔ ۔ نالش کی خبر سن کر آگ ہی تو ہو جائیں گے، خوب سوچ سمجھ لو۔
نتھو۔ ہوں! زمیندار جی بہت کریں گے تو زندہ جلا دیں گے۔ میں اب نہ ڈروں ہوں۔ یہ شریر تو ایک دن آگ میں جلنا ہے بابوجی۔
مہابیر۔ اچھا تو اب دوڑے چلے جاؤ۔ ۔ ۔ دیر نہ کرو!
نتھو۔ اچھا نمستے بابوجی!

(نتھو بھاگا چلا جاتا ہے۔ بملا آتی ہے۔ ہاتھ میں چوڑیاں اور بالیاں ہیں)

بملا۔ یہ لو بالیاں اور چوڑیاں!
مہابیر۔ لے جاؤ۔ اب نہیں چاہیئے۔ نتھو چلا گیا!
بملا۔ ایسا کونسی دور گیا ہو گا۔ ۔ ۔ اُسے بلا کر دے دو نا!
مہابیر۔ نہیں!
بملا۔ اب غصہ نہ کرو۔ لے لو!
مہابیر۔ میں نے اپنے ایک مِتر کے نام چٹھی لکھ دی ہے۔ نتھو کا کام بغیر خرچ لئے کر دیں گے۔
بملا۔ خرچہ بنا کون وکیل کام کرے گا
مہابیر۔ سب کے نزدیک پیسہ ہی تو ایک سب سے بڑی چیز نہیں ہے۔
بملا (دکھی ہو کر) اور جیسے میں تو پیسہ ہی کو سب سے بڑی چیز سمجھتی ہوں نا؟ کیوں تم کیوں مجھے ایسا سمجھتے ہو۔ ۔ ۔ کیوں مجھے ذلیل کرتے ہو؟
مہابیر۔ میں تو تمہیں ذلیل نہیں کرتا۔ کسی کے من میں ہی چور ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں!
بملا (روتے ہوئے) میں کوئی چور ہوں۔ نیچ ہوں۔ جو تم یہ کہہ رہے ہو۔
مہابیر۔ تم کیا کہہ رہی ہو بملا!
بملا۔ تم میری ہر بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہو۔ میرے سائے سے بھی گھن کرتے ہو۔ ہر وقت مجھے ذلیل کرتے ہو۔ اٹھتے بیٹھتے جوتیاں مارنے سے تو بہتر ہے ایک دفعہ گھر سے نکال دو نا؟
مہابیر (رکتے ہوئے) بملا!
بملا۔ نہیں اب میں چپ نہیں ہوں گی! میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ لیکن کیوں؟ ۔ ۔ کیوں نفرت کرتے ہو؟ بتاؤ! ۔ ۔ ۔ بولو!!
مہابیر۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ تمہاری باتوں سے مجھے نفرت ہے۔ دھن کے لئے تمہارا لوبھ۔ گہنے کے لئے

تمہارا چاؤ۔ حیثیت کے لئے تمہاری خواہش۔ تم ہی بتاؤ۔ یہ باتیں مجھے کیسے بھا سکتی ہیں؟

بملا۔ مجھے تو کسی بات کا چاؤ نہیں جس استری کو سوامی کی جھڑکیوں کے سوا کچھ نہ ملا ہو۔ وہ ان چیزوں کا چاؤ کیوں کرے گی۔

(بملا روتی ہوئی اندر چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد پیچھے سے آواز آتی ہے)

کمل (آواز) مہابیر پرشاد جی!.... مہابیر پرشاد جی اندر ہیں؟

مہابیر۔ کون ہے؟.... کون صاحب آئے ہیں؟

کمل (آواز) میں ہوں کمل... کمل پرشاد!

مہابیر (اٹھ کر پیچھے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اوہو کمل پرشاد جی!... آئیے! آئیے!!... اندر آئیے!

(کمل پرشاد اندر آتے ہیں۔ پینتالیس اڑتالیس کے درمیان عمر ہوگی۔ مہابیر پر شفقت کا اظہار ہے اور مہابیر کی نظر میں ان کا لحاظ)

کمل۔ ارے بھئی۔ بڑی مشکل سے تمہارا پتہ ملا ہے۔ تم تو ایسے راج منڈلی میں آکر رہے کہ پھر کسی کی خبر ہی نہ لی۔

مہابیر۔ جی تو میرا بھی بہت چاہتا تھا کہ کبھی شہر جاؤں۔ سب سے ملوں۔ لیکن کمل پرشاد جی۔ یہاں کے کاموں سے کبھی سمے ہی نہیں ملتا..... کہئے آپ کی صحت کیسی ہے؟.... اتنی دور آنے کا کیوں کشٹ اٹھایا؟

کمل۔ ارے بھئی صحت کا کچھ ایسا ہی حال ہے.... بڑھاپا آرہا ہے... کہو تم تو اچھی طرح ہو؟

مہابیر۔ پرماتما کی دیا ہے!

کمل۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔

مہابیر۔ (ہنس کر) آخر ایسا ضروری کام بھی کیا ہوا... ابھی تو آپ آئے ہیں۔ بیٹھئے۔ کام بھی ہو جائے گا

کمل۔ نہیں میرا کام نہیں... وہ... کلیانی کی بابت!

مہابیر (تنک کر) کلیانی کا نام میرے سامنے مت لیجئے۔ کمل پرشاد جی!

کمل۔ تم سنو تو۔

مہابیر۔ آپ مجھے شما کیجئے۔ میں کچھ نہیں سن سکتا!.... کلیانی کے پتا جی نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ میں ابھی بھولا نہیں ہوں!

کمل۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟.... انہوں نے تمہاری پڑھائی میں اتنی مدد کی تھی۔ ان کی مدد سے تو تم اتنے لائق ہوئے ہو اور اب ان ہی کو تم ایسی باتیں کہہ رہے ہو... اور وہ بھی میرے سامنے۔

مہابیر۔ آپ کو سب باتیں نہیں معلوم۔ یہ بتانے کی بات بھی نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے آپکے مشورہ سے کلیانی کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ جب میں بی اے کے امتحان میں اول آیا تو انہوں نے خود اپنی مرضی ظاہر کی کہ کلیانی کا ووواہ میرے ساتھ ہو جائے....

کمل۔ یہ تو میں جانتا ہوں مہابیر۔ کلیانی کی ماں نے کتنی ہی بار تمہارے ساتھ کلیانی کے ووواہ کے لئے مجھ سے بھی کہا تھا۔

مہابیر۔ اس وقت انہیں دھن سے زیادہ گن کا خیال تھا!

کمل۔ وہ تو تمہیں بہت پسند کرتے تھے۔

مہابیر۔ لیکن پھر انہیں دھن کا لوبھ زیادہ ہوگیا تھا۔ میرا ایم اے کا نتیجہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ دوسرے میں نے دیش سیوا کی سوگند لے لی تھی۔ یہ بات انہیں نہیں بھاتی اور ایک دن ذرا سی بات پر انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

کمل۔ مجھے تو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔۔۔ لیکن مہابیر اس میں کلیانی کا کیا دوش؟

مہابیر۔ دوش سارا کلیانی کا ہے۔ اس نے مجھے بچن دیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ دیش کی سیوا کرے گی۔ لیکن کلیانی کو اپنے بچن کا بھی پاس نہیں ہوا!

کمل۔ تم کلیانی کو غلط سمجھے ہو مہابیر!

مہابیر (ہنس کر) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کمل۔ کلیانی وِدھوا ہو گئی ہے جانتے ہو؟

مہابیر۔ وِدھوا؟

کمل۔ اور اب وہ بالکل بے آسرا ہے!

مہابیر۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں کمل پرشاد جی؟ کلیانی کے پتی تو امیر آدمی تھے۔ زمین تھی! جائداد تھی!!

کمل۔ لیکن کلیانی اور اس کی لڑکی سادھنا کو کچھ نہیں ملا۔ کلیانی کا جو کچھ اپنا گہنا زیور ہے۔ بس وہ ہے اور کچھ نہیں۔ اب وہ دونوں بے آسرا ہیں!

مہابیر۔ تو آج کل وہ ہیں کہاں؟۔۔۔ کس کے پاس ہیں؟

کمل۔ میں تمہارے پاس اسی لئے تو آیا ہوں مہابیر۔۔۔ تم کلیانی کو آسرا دو!

مہابیر (حیرت سے) میں؟

کمل۔ ہاں! ہاں! تم!

مہابیر۔ یہ نہیں ہو سکتا کمل پرشاد جی۔۔۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا!

کمل۔ میں تو اسے ساتھ لے آیا ہوں مہابیر!

مہابیر۔ یہ کیا کیا آپ نے؟۔۔۔ کہاں ہے کلیانی؟

کمل۔ اسٹیشن سے بیل گاڑی میں آ رہی ہے۔۔۔ میں تمہیں خبر دینے آگے آگے آگیا تھا۔

مہابیر۔ یہ آپ نے برا کیا مہابیر پرشاد جی۔۔۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔

کمل۔ مجھے تم سے بڑی آشا تھی۔۔۔ کلیانی کو یہ سن کر بہت دکھ ہوگا۔۔۔ وہ بہت دکھی ہے۔۔۔ اسے تم پر بہت وشواش ہے۔

مہابیر۔ لیکن آپ یہ بھی تو سوچئے۔ کلیانی بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کا اتنا جیون سکھ میں بیتا ہے۔ اگر اس غریبی کی چِتا وہ سہار سکتی تو اسے اپنے بچن کا پالن کرنے سے کون روک سکتا تھا۔۔۔ اب آپ انہیں واپس لے جائیے

(پیچھے کے دروازے سے کلیانی داخل ہوتی ہے۔ عمر ۲۵ سال ہے۔ رنگ بہت صاف ہے۔ لیکن غم سے چہرہ اترا ہوا ہے۔ سادی دھوتی باندھے ہے۔ ہاتھ میں ضرورت کی کچھ چھوٹی چیزیں ہیں۔ سادھنا ساتھ ہے۔ سادھنا کی عمر ۷ سال ہوگی۔ بہت پیاری شکل ہے)

کلیانی۔ میں اب آگئی ہوں تو جاؤں گی نہیں مہابیر بھائی!

مہابیر۔ کون؟ کلیانی!

کلیانی (سادھنا سے) سادھنا نمستے کرو!... تمہارے ماما!

سادھنا۔ نمستے ماما جی!

مہابیر۔ لیکن کلیانی۔ گاؤں کا جیون۔ یہاں کی بپتائیں تم نہیں سہار سکو گی۔ تم واپس چلی جاؤ

کمل (دکھ کے ساتھ) مہابیر!.... (ہراس ہو کر) چلو کلیانی۔ واپس چلو۔ آؤ سادھنا!

(دائیں جانب اندر کے دروازے سے آواز آتی ہے)

بملا (آواز) اجی میں نے کہا.... ابھی ایک گاڑی آکر رکی ہے.... (داخل ہوتی ہے) کون آیا ہے؟

کلیانی۔ آپ بھابی جی ہیں نا؟

بملا۔ ہاں آؤ اندر آؤ نا!

کمل۔ یہ جا رہی ہیں۔ آؤ کلیانی چلو۔

بملا۔ ابھی تو آئی ہیں۔ کچھ دیر بیٹھیں گی۔ کھائیں پئیں گی۔ آتے دیر نہ ہوئی کہ جانے بھی لگیں.... یہ کیسے ہو سکتا ہے...

(مہابیر سے) اجی تم روکتے کیوں نہیں؟

مہابیر۔ یہ یہاں رہنے آئی ہیں!

کمل۔ اور یہ انہیں واپس بھیج رہے ہیں!

بملا۔ تمہارے بھائی بہت کٹھور ہیں جو بہن کو واپس بھیج دیتے ہیں اور تم تو مجھ سے ملے بنا ہی لوٹ چلی تھیں۔

کلیانی۔ بھول ہوئی تھی بھابی جی!

بملا۔ بھائی کے گھر آنے کے لئے بھائی سے پوچھنا کوئی تھوڑی ہوتا ہے!

کلیانی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں

بملا۔ اوہوں۔ میں نہیں جانے دوں گی.... یہ تمہاری لڑکی ہے.... کیا نام ہے؟

کلیانی۔ سادھنا! (سادھنا سے) نمستے کرو۔ تمہاری مامی ہیں۔

سادھنا۔ نمستے مامی جی!

بملا۔ کیسی پیاری لڑکی ہے.... اچھا اب آؤ اندر چلو۔ اتنی دور سے آرہی ہو۔ تھک گئی ہو گی (کمل پرشاد سے) آئیے آپ بھی اندر آئیے۔ منہ ہاتھ ذرا دھو لیجئے

(کمل، کلیانی اور سادھنا اندر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے نتھو کی پھر آواز آتی ہے)

نتھو (آواز) بابو جی... بابو جی!!

مہابیر۔ کیا ہے نتھو؟

نتھو (داخل ہوتا ہے) تمہاری چٹھی پیروی وکیل بابو نے

مہابیر۔ تو اب کیا کیا جائے نتھو؟

ننھو۔ بابوجی۔ تم بھی تو وکالت پڑھے ہو۔ تم خود یو کاج کیوں نہیں کردیتے۔
مہابیر۔ میں وکالت کرتا ہوتا تو ضرور تمہارا یہ کام کر دیتا۔
ننھو۔ بابوجی۔ تم وکالت کرلونا!
مہابیر۔ اور اس پاٹھ شالہ کا کیا ہوگا؟ ۔۔۔۔ اچھا ننھو۔ تم تھوڑی دیر باہر ٹھیرو۔ میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔
ننھو (خوش ہوکر) اچھا بابوجی! (باہر چلا جاتا ہے)
مہابیر (آواز دیتا ہے) کلیانی!
کلیانی (اندر سے آواز آتی ہے) مجھے بلاتے ہو مہابیر بھیا؟ ۔۔۔ آئی ۔۔۔ (داخل ہوتی ہے) کیا بات ہے؟
مہابیر۔ ایک کام ہے کلیانی!
کلیانی۔ بتائیے!
مہابیر۔ تمہیں یاد ہے تم نے وچن دیا تھا کہ تم میرے ساتھ دیش کی سیوا کروگی!
کلیانی۔ یاد ہے بھائی۔ اسی لئے اب آپ کے پاس آئی ہوں کہ سیوا میں میں بھی آپ کا کچھ ہاتھ بٹا سکوں۔
مہابیر۔ میں نے راج منڈلی کے لڑکے لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے پاٹھ شالہ کھولا تھا۔ اب اس پاٹھ شالہ کا کام تمہیں سنبھالنا ہوگا۔
کلیانی۔ آپ جو کام بتائیں گے میں کروں گی!
مہابیر۔ اب تمہیں اکیلے یہ سب کام سنبھالنا ہوگا۔ میں اب پھر وکالت کرنا چاہتا ہوں
کلیانی۔ اب مجھے اشیرواد دیجئے کہ میں یہ کام کرسکوں!
مہابیر۔ میں تمہیں اشیرواد دیتا ہوں بہن!

(بملا آتی ہے)

بملا۔ اجی تم بھی تو آکر کچھ کھالونا!
مہابیر۔ ارے یہ تمہارے ہاتھ اتنا سارا گہنا کہاں سے تگ گیا؟
بملا۔ میں اسے پہن کر زمیندار جی کے ہاں کھانا کھانے جارہی ہوں (ہنستی ہے) زمیندار جی زیور دیکھ کر کھانا کھلاتے ہیں
مہابیر۔ تمہیں مانگ کر گہنا پہنتے لاج نہیں آتی؟
بملا۔ ارے واہ۔ میں کسی سے مانگنے کیوں جاتی! ۔۔۔ یہ گہنا میری بہو کا ہے! ۔۔۔ میں نے کیلاش کے بیاہ کی بات کرلی ہے۔
مہابیر۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟
بملا۔ کلیانی بہن کی لڑکی سادھنا کے ساتھ!
مہابیر (ہنستا ہے) اچھا!

(بملا اور کلیانی بھی ہنستی ہیں)

تین سال بعد

مہابیر پرشاد راج منڈلی سے تحصیل میں آ گئے اور یہاں وکالت کرتے ہیں

مہابیر پرشاد کے مکان کا کمرہ۔ کمرہ چھوٹا ہے اور بہائی تیائی بھی معمولی قسم کی ہے۔ کسی قسم کی سجاوٹ کا کوئی سامان نہیں ہے۔ کمرے کے بیچ میں ایک میز ہے جس پر کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ مہابیر پرشاد بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ میز کے سامنے دو تین کرسیاں رکھی ہیں۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک طرف کتابوں کی الماری ہے جس میں قانون کی کتابیں رکھی ہیں اور دوسری طرف ایک میز رکھی ہے جس پر محرری کا ضروری سامان رکھا ہے۔ بائیں طرف دروازہ باہر سڑک پر کھلتا ہے اور جانے کا دروازہ دائیں طرف ہے۔ جس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

مہابیر پرشاد اب چالیس کی منزل سے گذر چکے ہیں۔ عمر کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں۔ لیکن اب معاشی حالت بہتر ہونے کے سبب چہرے پر وہ سختی نہیں رہی جو آج سے تین سال پہلے تھی۔

گوپی ناتھ (بائیں طرف سے آواز) مہابیر پرشاد جی!

مہابیر۔ کون صاحب ہیں؟ . . . . اندر تشریف لائیے۔

(گوپی ناتھ داخل ہوتا ہے۔ عمر میں مہابیر پرشاد کے لگ بھگ ہوگا۔ لباس بہت اچھا ہے)

گوپی ناتھ۔ نمستے! مہابیر پرشاد جی!

مہابیر (حیرت سے) گوپی ناتھ! . . . . (خودداری کے ساتھ) نمستے!

گوپی ناتھ۔ آپ مجھے پہچانتے تو ہیں؟

مہابیر۔ جی ہاں۔ آپ زمیندار رگھو کرداس کے منتظم ہیں (طنزآمیز ہنسی) بھلا میں آپ کو نہیں پہچانوں گا؟ . . . تشریف رکھیے۔

گوپی ناتھ (کھسیانی ہنسی) مجھے آپ سے ایسی ہی آشا تھی۔ کچہری میں اکثر آمنا سامنا ہوا ہے۔ لیکن کبھی بات کرنے کا موقعہ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ چل کر آپ سے دو باتیں ہی کر آؤں!

مہابیر۔ بڑی دیا کی!

گوپی ناتھ (ہنس کر) آپ کیسی باتیں کرتے ہیں مہابیر پرشاد جی . . . آپ ہوئے پنڈت، براہمن، ودیا ذ گیانی مہا پرش

مہابیر (بات کاٹ کر) یہ باتیں تو رہنے دیجیئے گوپی ناتھ جی۔ اور آج مجھے کچہری میں کام بہت ہے . . . . اگر میں آپ کی کچھ سیوا کر سکتا ہوں تو بتایئے . . . . (کچھ کاغذات دیکھنے لگتا ہے)

گوپی ناتھ۔ دیکھیئے۔ دھیرج سے پہلے میری بات سن لیجئے۔ پھر آپ وچار کیجئے گا۔ میں جو بات کہوں گا۔ بھلی بات ہوگی۔

مہابیر (کاغذات پر سے نظر اٹھائے بغیر) کہئے!

گوپی ناتھ۔ آپ جانیں زمیندار رگھو کرداس جی کی بہت بڑی زمینداری ہے۔ اتنی زمینیں کسانوں کا کاشت کے لئے دی ہوئی ہیں۔ آپ جانیں یہ کسان اوجڈ، ان پڑھ گنوار ہوتے ہیں۔ ان میں سمجھ بوجھ تو ہوتی نہیں۔ آپ جانیں اگر زمیندار کے کام میں کبھی کبھی زیادتی نہ کی جائے تو کام چوپٹ ہو جائے۔ پھر کچہری عدالت میں بھی ہوتی ہی ہے۔ اتنی بڑی

زمینداری ہے۔ دس بیس مقدمے چلتے ہی رہتے ہیں۔ آپ جانیں مجھے تو قانون آتا نہیں لیکن جتنم جو ہوا ... سے بہت سر مارنا پڑتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کوئی اچھا وکیل مل جائے تو یہ سارا کام اسے سونپ دوں۔ آپ جانیں زمیندار جی ایسے کاموں میں روپیہ کا منہ تو کرتے نہیں ہیں۔ ہر مہینہ بندھی تنخواہ دیں گے اور جتنے مقدمے ہوں گے۔ ان کا محنتانہ الگ ملے گا۔

مہابیر۔ اور کچھ بات کہنی ہے گوپی ناتھ جی۔ یا بس یہی کہنے آئے تھے۔

گوپی ناتھ۔ یہ تو آپکے وچار کی بات ہے۔ میں اب اور کیا کہوں۔ آپ خود بہت بدھمیان ہیں۔ آپ جانیں زمینداری میں یہ جو چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ ان سے دل میلا کرنا آپ جیسے آدمیوں کو شوبھا نہیں دیتا۔ میری بات مانیں تو جو ہووے گا۔ اس پر راکھ ڈالیں۔ آپ جانیں زمیندار جی سے آپ کا کیا جھگڑا۔ جھگڑا کسان اور زمیندار کا ٹھیرا۔ آپ زمیندار جی سے سمجھوتہ کر لیجئے۔

مہابیر۔ نیائے اور انیائے میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

گوپی ناتھ۔ اوہو۔ مہابیر پرشاد جی! آپنے میری بات پوری تو سنی نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آپ ان کسانوں کے لئے اتنی چنتا کرتے ہیں۔ ورنہ ان اجڈ لوگوں کو تو کچھ سدھ بدھ ہے نہیں۔ آپ اپنے خرچ پر ان کی طرف سے زمیندار جی سے مقدمے کرتے ہیں۔ محنت بھی آپ کی اور پیسہ بھی آپ کا۔ اور پھر آپ جانیں ان تین سالوں میں آپنے اتنے مقدمے کئے۔ اسی ایک سال میں آپ نے زمیندار جی کے خلاف پنتالیس مقدمے کئے۔ آپ جانیں میں سب حساب رکھتا ہوں۔ ان پنتالیس مقدموں میں سے پندرہ کا خرچہ بھی تو آپ کو عدالت نے نہیں دلوایا۔ اب یہی لیجئے ننھو والا مقدمہ۔ اس اپیل کا خرچ بھی تو اپنی گرہ سے دیا ہے۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے . . .

مہابیر۔ آپ اپنا اور میرا دونوں کا سمے خراب کر رہے ہیں!

گوپی ناتھ۔ سمے میری ان باتوں سے خراب نہیں ہوتا۔ سمے خراب ہوتا ہے آپکے ان بیکار مقدموں سے۔

مہابیر۔ آپ یہی کہنے آئے تھے یہاں؟

گوپی ناتھ۔ آپ کو بتانے آیا تھا کہ آپ کو کچہری میں کھڑے ہو کر گلا تھکاتے ہوئے تین سال ہو گئے مگر زمینداری کے کام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر زور لگا کر آپ نے یہاں مقدمہ جیتا تو ہائی کورٹ میں جا کر منہ کی کھائی۔

مہابیر۔ آپ میرے گھر آ کر میرا اپمان کر رہے ہیں!

گوپی ناتھ۔ اب آپ ننھو کے مقدمہ کی اپیل کا فیصلہ بھی سن لیجئے گا۔ بڑا گھمنڈ ہے نا۔

مہابیر۔ نمستے!

گوپی ناتھ۔ نمستے!

(گوپی ناتھ جلدی سے بائیں طرف کے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور ننھو کی آواز باہر سے آتی ہے)

ننھو (آواز) اجی بابو جی!

مہابیر۔ کون؟ . . . ننھو!

ننھو (داخل ہوتا ہے) نمستے بابو جی!

مہابیر۔ میں تو تجھے یاد ہی کر رہا تھا۔ راج منڈلی سے کب آیا؟

نتھو۔ ابھی ابھی مہاراج! بہن جی بھی ساتھ آئی ہیں!

مہابیر۔ کون؟ کلیانی!

نتھو۔ جی ہاں۔ بابو جی! اپیل کا فیصلہ تو سنایا جائے گا نا آج!.... فیصلہ سننے وہ بھی ساتھ آگئیں۔

مہابیر۔ اچھا!.... اچھا دیکھیو ذرا نتھو اندر جائیو۔ میں نے ابھی تک اشنان نہیں کیا ہے۔ اشنان کا پانی رکھنے کو کہیو۔

نتھو۔ اچھا بابو جی! (اندر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بائیں طرف سے کلیانی آتی ہے)

کلیانی۔ مہابیر بھیا!

مہابیر (کھڑا ہو جاتا ہے) آؤ، بہن آؤ۔ اچھی تو ہو؟

کلیانی۔ ہاں بھیا!.... سب کو دیکھے بہت دن ہو گئے۔ نتھو آ رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ملنے چلی آئی۔

مہابیر۔ سادھنا کیسی ہے؟ اسے ساتھ نہیں لائیں؟

کلیانی۔ وہ بھی آئی ہے۔ شاما سے باتیں کر رہی ہے.... اور ہاں یہ تو بتائیے نتھو کی اپیل کی کیا خبر ہے؟

مہابیر۔ میں تو ان ایڈووکیٹوں سے تنگ آگیا ہوں۔ میں نے مقدمے کے لئے سارے نقطے جمع کر دیئے تھے۔ لیکن انہوں نے پیروی بڑی دبی زبان سے کی جو مقدمے ہم یہاں اتنی محنت سے جیتتے ہیں۔ وہ یہ ہار دیتے ہیں۔

کلیانی۔ آپ ہائی کورٹ میں پیروی خود کیوں نہیں کرتے.... اب تو آپ کو تین سال وکالت کرتے بھی ہو گئے!

مہابیر۔ میں یہاں کے کام سے ہی مرا جاتا ہوں!

کلیانی۔ تو اتنا کام لیتے کیوں ہیں؟

مہابیر (ہنس کر) بیگار کا کام کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

(کلیانی بھی ہنستی ہے)

مہابیر۔ اور ہاں۔ ہمارے پاٹھ شالا کی کیا خبر ہے؟

کلیانی۔ چل رہا ہے۔

مہابیر۔ کتنے لڑکے لڑکیاں ہیں آج کل پاٹھ شالا میں؟

کلیانی۔ آٹھ دس! زمیندار جی کے ڈر سے اب کوئی بھی اپنے لڑکے لڑکی کو پاٹھ شالا نہیں بھیجتا۔

مہابیر۔ تمہارا خرچ کیسے چلتا ہے پھر؟

کلیانی۔ خرچ تو چل ہی جاتا ہے!

مہابیر۔ لیکن کیسے، تمہارا خرچ ہے۔ سادھنا کا خرچ ہے اور پھر پاٹھ شالا میں بھی تو کچھ خرچ ہوتا ہی ہے۔

کلیانی۔ آپ چنتا کیوں کرتے ہیں۔ پاٹھ شالا کی زمین میں تو ری ترکاری ہو جاتی ہے۔ ایک گائے ہے اس کا دودھ ہوتا ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیوں کا سینا پرونا کچھ کر دیتی ہوں۔

مہابیر۔ یہ تو میں سمجھ گیا۔ لیکن تم اتنا دکھ کیوں اٹھاتی ہو؟

کلیانی۔ مجھے تو کچھ دکھ نہیں مہابیر بھیا۔ ہوتا تو تم سے نہ کہتی اور پیسے کی تو مجھے کچھ چنتا نہیں ہے جو اپنی محنت سے مجھے

مل جاتا ہے۔ میرے لئے بہت ہوتا ہے۔

مہابیر۔ تمہارا اب راج منڈلی میں اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ تم جانتی ہو زمینداروں سے بنانے کے ٹھیکا کا چکّر چل رہا ہے وہ اسے اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی ان سے بنائے چاہے اور جب انہیں یہ گمان ہو جائے کہ ان کا ایمان ہوا ہے تو غصہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور جب بدلہ لینے پر آتے ہیں تو آدمی نہیں وحشی جانور ہو جاتے ہیں۔

کلیانی (ہنس کر) تو میرا کیا کر دیں گے؟

مہابیر۔ تم نہیں سمجھتی کلیانی!

کلیانی۔ اور وہاں میری سہائتا کو جو نتھو جو ہے . . . وہ تو اپنی چھوٹی بہن کی طرح میرا خیال رکھتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے نتھو لیکن زمینداروں کے آدمیوں نے بچارے کو تنگ کر رکھا ہے۔

مہابیر۔ تمہیں یہاں آکر رہنے میں کچھ لاج ہے؟

کلیانی (ہنستی ہے) یہ تو میرے اپنے بھائی کا گھر ہے۔ اس میں لاج کیا ہوتی اور بھابی جی تو مجھے بہت چاؤ سے رکھیں گی۔ وہ تو مجھے بہت پسند کرتی ہیں۔

مہابیر۔ یہاں آنا نہ آنا تمہاری مرضی پر ہے۔ میرے پاس ہر وقت تمہارے لئے جگہ رہے گی!

کلیانی۔ یہ میرا سوبھاگیہ ہے!

(اندر سے نتھو آتا ہے)

نتھو۔ اشنان کے لئے پانی رکھ دیا ہے بابو جی!

مہابیر۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔

(مہابیر چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے نتھو بھی جاتا ہے کہ اتنے میں بملا آتی ہے)

بملا۔ ارے کلیانی بہن، تم آئیں بھی تو اندر آکر مجھے شکل بھی نہ دکھائی۔

کلیانی۔ نمستے بھابی جی!

بملا (گلے لگا لیتی ہے) مجھ سے تو نتھو نے جا کر کہا!

کلیانی۔ بھیا نے باتوں میں لگا لیا تھا!

بملا۔ آؤ چلو اندر چلو۔ اس دفعہ تو تم بہت دنوں بعد آئی ہو۔ کیلاش اور شاما تو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ سادھنا کو تو ساتھ لائی ہو نا؟

کلیانی۔ ہاں ہاں۔ شاما سے باتیں کر رہی ہے۔

(باہر بالکل دروازہ پر زور سے ڈھول اور باجے کا غل سنائی دیتا ہے)

بملا۔ ارے یہ ڈھول کہاں بجا۔ باجے . . . ارے نتھو۔ ذرا دیکھ تو یہ کیا تماشہ ہے۔

(باہر سے نعرہ سنائی دیتا ہے۔ زمیندار ٹھاکر داس کی جے۔ گوپی ناتھ جی کی جے)

کیلاش (باہر طرف سے داخل ہوتا ہے) ماں! ماں!!

بملا۔ یہ باہر کیا ہو رہا ہے کیلاش؟

(اندر سے نتھو بھی آجاتا ہے)

کیلاش۔ اپیل میں نتھو چاچا کے خلاف فیصلہ ہوا ہے۔

بملا۔ فیصلہ سنا دیا گیا؟

کیلاش۔ ہاں اسی لئے تو زمیندار جی کے آدمی اب ڈھول بجا رہے ہیں۔

نتھو (غصہ سے) بڑے آئے ڈھول بجانے والے۔ کہاں ہے لاٹھی۔۔۔ میں مار مار لاٹھیاں ڈھول توڑ دوں گا۔

کیلاش (روکتے ہوئے) کیا کرتے ہو نتھو چاچا؟

بملا (منع کرتے ہوئے) نتھو!

کلیانی۔ نتھو بھائی۔ غصہ نہیں کرتے۔ چلو اندر چلو۔

نتھو (غصہ سے) ذرا دیکھو تو۔۔۔ ڈھول بجا رہے ہیں ڈھول۔۔۔ ڈھول بجا رہے ہیں۔

کلیانی۔ بجانے دو۔ ہمیں کیا۔۔۔ تم اندر چلو

(کلیانی نتھو کو اندر لے جاتی ہے)

بملا۔ تم کھڑے دیکھ کیا رہے ہو کیلاش۔ جا کر انہیں منع کیوں نہیں کرتے۔

کیلاش۔ منع کرنے سے مانیں گے نہیں۔

بملا۔ وہ ہمارا اپمان کر رہے ہیں اور تم کھڑے دیکھ رہے ہو۔

کیلاش۔ اس سے ہمارا اپمان نہیں ہوتا ماں۔ وہ اپنا انیائے سب کو ڈھول بجا کر سنا رہے ہیں۔

بملا۔ اپنے پتا کی طرح تم نے بھی باتیں بنانی سیکھ لی ہیں۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ کون بجاتا ہے ڈھول میرے گھر کے آگے (باہر جاتی ہے) یہاں کون بجا رہا ہے ڈھول۔ جاؤ یہاں سے۔ یہاں سے جاؤ۔

(اندر سے جابیر آتا ہے)

جابیر (آواز دیتا ہے) بملا!

بملا (باہر سے آواز آرہی ہے) پہلے جاؤ یہاں سے سننے ہو یا نہیں

جابیر (باہر سے بملا کو پکڑ کر لے آتا ہے) یہ کیا ہو رہا ہے بملا۔۔۔ (کیلاش سے) نتھو کہاں ہے؟

کیلاش۔ اندر ہے!

(لاٹھی اٹھائے اندر سے نتھو آتا ہے)

نتھو۔ میں دیکھتا ہوں اب کون بجاتا ہے ڈھول۔۔۔ کوئی ہے ایسا مائی کا لال۔

جابیر (نتھو کو پکڑ لیتا ہے) نتھو!

نتھو۔ دیکھا آپ نے بابو جی۔ دیکھا آپ نے!

جابیر۔ ہاں اس کا پرایسچت زمیندار جی کو کرنا ہوگا۔۔۔ میں اب ایڈووکیٹ ہو کر دیکھتا ہوں۔ زمیندار جی کی اپیلیں کیسی چلتی ہیں۔ زمیندار جی کا یہ انیائے کب تک چلتا ہے۔

دو سال بعد

مہابیر پرشاد جی تحصیل سے ضلع میں آ گئے ہیں اور اب ایڈوکیٹ ہیں۔

مہابیر پرشاد کا کمرہ۔ کمرہ کافی بڑا ہے۔ جملہ سامان اچھی قسم کا ہے۔ قانون کی کتابیں خوشنما جلدوں میں سلیقے سے الماریوں میں رکھی ہیں۔ بڑی لکھنے کی میز رکھی ہے۔ گھومنے والی کرسی اور کچھ اور ضروری فرنیچر۔ کمرہ میں ایک قالین بھی بچھا ہوا ہے۔ اب مہابیر پرشاد ایک خوش حال آدمی ہیں۔

مہابیر پرشاد بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ دائیں جانب کا دروازہ اندر کھلتا ہے۔ اسی جانب سے بملا آتی ہے۔ ہاتھ میں پوجا کی تھالی ہے۔

بملا۔ تم بھی تو ذرا سا پرشاد لے لو پوجا کا!

مہابیر۔ ٹھاکر جی کی پوجا ہو گئی؟ ..... آج تم نے ان سے کتنا روپیہ مانگا؟

بملا۔ نہیں روپیہ تو کچھ نہیں مانگا۔

مہابیر (ہنس کر) اچھا؟ ..... تو پھر آج پرارتھنا کس لئے کی ہے؟

بملا۔ تمہاری وجہ کے لئے!

مہابیر (حیرت سے) میری وجہ کے لئے؟

بملا۔ ہاں!

مہابیر۔ میں دکھن ہوں بملا! تمہی کی ایسی پرارتھنا سے سوامی کو بہت خوشی ہوتی ہے!

بملا۔ یہ لو پوجا کا پرشاد! (دیتی ہے)

مہابیر۔ آج کیلاش کا جنم دن ہے!

بملا۔ ہاں! آج وہ اٹھارویں میں لگا ہے۔ میں کہتی ہوں۔ اب اس کا بیاہ کر دو نا؟ ... کلیانی بہن کی لڑکی سادھنا بھی اب سیانی ہو گئی ہے۔

مہابیر (ہنس کر) بیاہ کے علاوہ بھی کیلاش کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

بملا۔ یہ تو میں جانتی ہوں۔ لیکن بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے نا!

مہابیر۔ آخر ایسی جلدی کیا ہے۔ ...

بملا۔ تم تو یہی کہتے رہو گے۔ ... میرا دل چاہتا ہے کہ سادھنا آج ہی میرے گھر آ جائے۔

مہابیر۔ تم نے کلیانی کو لینے کسی کو راج منڈلی بھی بھیجا ہے؟

بملا۔ نتھو ہے تو وہاں۔ اس کے ساتھ آ جائیں گی۔ انہیں تو کل ہی آ جانا چاہئے تھا۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ ایک رات پہلے سے آ جاؤں گی۔

مہابیر۔ ذرا کیلاش کو تو آواز دو!

بملا۔ کیلاش!... کیلاش!!

(اندر سے کیلاش آتا ہے)

کیلاش۔ کیا ہے ماں؟

مہابیر۔ آج تمہارا جنم دن ہے!

بملا۔ آج تم دو گے کیا کیلاش کو؟

کیلاش۔ آپ اشیرباد دیجئے مجھے پتاجی!

مہابیر۔ (ہنس کر) ارے یہ تو میں تمہیں روز ہی دیتا ہوں

کیلاش۔ روز تو آپ مجھے بیٹا جان کر اشیرباد دیتے ہیں۔ آج اشیرباد دیجئے ایک سیوک سمجھ کر۔ مجھے اشیرباد دیجئے کہ میں بھی آپ کی طرح دیش کے غریب لوگوں کو ان کے ادھیکار کا احساس دلاؤں اور ان کے رکھشا ہیں یوں بتا دوں۔

مہابیر۔ اتنے بڑے دیش کی سیوا کے لئے ابھی تم بہت چھوٹے ہو کیلاش! (ہنستا ہے)

بملا۔ ہنستے کیا ہو تمہارا ہی سپوت ہے

مہابیر۔ پہلے تم پڑھ لکھ لو۔ پھر دیش سیوا کرنا۔ سمجھے!

بملا۔ تم نے پڑھ لکھ کر دیس سیوا کی سوگند لی تھی۔ اس لئے یہ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم اسے اشیرباد کیوں نہیں دیتے۔ اس کا من بڑھ جائے گا

مہابیر۔ اچھا یہاں آؤ کیلاش!

کیلاش۔ (پتا کے چرنوں میں جھک کر) پتاجی!

مہابیر۔ ابھی یہ سمجھنے کو تمہارے لئے بہت سمے ہے کہ دیش کی سیوا کیسے کرنی چاہئے۔ منش کے لئے سب سے بڑا کام ہے اپنے کو پہچاننا۔ اپنے ادھیکاروں کو سمجھنا۔ پھر اپنی پوری شکتی سے وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہئے جو منش کا جیون سدھ ادھیکار ہے۔ میں تمہیں اشیرباد دیتا ہوں کہ تم وہ سب کچھ کر سکو جو تمہیں کرنا ہے۔

کیلاش۔ تم بھی تو مجھے اشیرباد دو ماں!

بملا۔ (ہنس کر) ارے مجھ سے کیا اشیرباد مانگتا ہے . . . . .

کیلاش۔ مجھے اشیرباد دیجئے کہ دھن کا لوبھ مجھے اپنے راستہ سے نہ ہٹائے اور غریبی کو بڑی دولت سمجھوں۔

بملا۔ (ہنستی ہے) اجی سنتے ہو! . . . کسی نے سچ کہا ہے۔ پتا پر پوت، پرا پت گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا!

(مہابیر اس ہنسی میں شریک نہیں ہوتا۔ بائیں جانب باہر سے کلیانی کی آواز آتی ہے)

کلیانی (آواز) اور ہاں نتھو بھائی دیکھنا سامان سب اتروا لینا۔ رہ نہ جائے کوئی چیز . . . شاد صاحب تم نتھو چاچا کے ساتھ سامان رکھواؤ۔

کیلاش۔ لو آ جی آ گئیں ماں!

بملا۔ جاؤ تم ذرا اتراؤ تو انہیں . . . . شاما سے کہنا سب سامان اپنے برابر والے کمرے میں رکھوائے

کیلاش۔ اچھا ماں! (باہر چلا جاتا ہے۔ کلیانی اندر آتی ہے)

بملا۔ آؤ بہن تم نے تو بہت دیر کر دی۔ میں تو تمہاری راہ دیکھ کر پوجا بھی کر چکی!

کلیانی۔ دیر ہو گئی۔ نتھو بھائی کے پاس زمیندار جی کے مہتمم گوپی ناتھ آئے ہوئے تھے اور کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔ انہوں نے ہی دیر کرا دی۔

مہابیر۔ گوپی ناتھ کو نتھو کے ساتھ ابھی کچھ اور کرنا باقی ہے۔ جو اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

کلیانی (ہنس کر) نہیں بھیا۔ یہ بات نہیں۔ اب تو نتھو کی خوشامد ہو رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپس میں فیصلہ ہو جائے

مہابیر (غصہ سے) اگر فیصلہ کرنے کا ارادہ تھا تو یہ سب انیائے کیوں کیا تھا؟... نتھو کو یوں برباد کیوں کیا تھا؟

کلیانی۔ لیکن مہابیر بھیا۔ اب تو نتھو کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ ان لوگوں نے اس غریب کو کہیں کا نہیں رکھا۔ عدالت میں فیصلہ ہونے میں دیر لگے گا۔ اتنے سمے نتھو جیون کیسے بتائے گا؟

مہابیر۔ جب اتنا کشٹ اٹھایا ہے تو تھوڑے دن اور سہی

بملا۔ نتھو تمہارے ساتھ تو آیا ہے نا؟

کلیانی۔ ہاں!

بملا۔ اور اب سادھنا کیسی ہے۔ اسے دیکھنے کو تو بہت من کر رہا تھا!

کلیانی۔ تم نے اسے بلا کیوں نہیں لیا۔ میں نے تو نہیں روکی۔ وہ تو تمہاری ہی چیز ہے (ہنستی ہے)

بملا۔ یہ تو میں جانتی ہوں (ہنستی ہے)

کلیانی۔ اور تم نے کچھ اور بھی سنا؟

بملا۔ کیا؟

کلیانی۔ زمیندار جی نے اپنے لڑکے کے لئے سادھنا کو مانگا تھا۔

بملا۔ سچ!

کلیانی۔ ہاں۔ ہاں (ہنستی ہے) مجھ سے تو ہنسی رکی نہیں۔ زمیندار جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیوں مہابیر بھیا۔

مہابیر۔ نہیں۔ زمیندار جی کا دماغ اب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔

کلیانی (حیرت سے) آپ کا خیال ہے کہ....

مہابیر۔ سنو کلیانی میں بتاتا ہوں۔ راج منڈلی زمیندار جی کی ریاست تھی۔ نیائے انیائے جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ کوئی دم بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے جب نتھو کے مقدمے کا کام سنبھالا تو زمیندار جی کے کان ہو گئے۔ لیکن جب ہم اپیل ہار گئے تو وہ سمجھے کہ کھوئی خدائی پھر سے مل گئی۔ اسی دھن میں انہوں نے نتھو کی زمین چھین لی۔ اس کے مویشی کھول لئے۔ اس کا اناج جلا دیا اور اس کے گھر کو آگ لگوا دی۔ وہ گاؤں والوں کو سبق سکھانا چاہتے تھے کہ ان کے خلاف مقدمہ کرنے کا یہ پھل ملتا ہے۔ لیکن اب زمیندار جی کو معلوم ہو گیا ہے کہ انہیں اس پاپ کا پرائشچت کرنا ہوگا۔ مقدمہ کی اپیل انہوں نے کی ہے۔ لیکن وہاں بھی انہیں کوئی آشا نہیں۔ اس لئے اب گوپی ناتھ نتھو کے پیچھے پڑ رہے ہیں۔

بملا۔ وہ نجھو کے بیر چھپا کریں۔ لیکن سادھنا نے ان کا کیا کام اڑکا ہوا ہے جو اس کو اپنے اتنے کھٹے مانگ رہے ہیں۔

کلیانی۔ وہ مانگا کریں۔ میں کب انہیں اپنی لڑکی دیتی ہوں۔

بملا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے پاس دھن ہے تو ہر کوئی انہیں لڑکی دے دیگا۔ سادھنا کے گن اتنے ہیں کہ ان کے پاس اتنا دھن بھی نہیں ہوگا۔

کلیانی۔ اچھا اب چھوڑو بھی ان باتوں کو۔

بملا۔ چلو اندر چلو نا۔ کیلاش کے جنم دن کے لئے میں نے مٹھائی پھل اور نمکین چیزیں منگائی ہیں۔ تم نے تو انہیں دیکھا ہو کوئی اگر رہ گئی ہو تو ابھی تو منگائی جا سکتی ہے۔ شاما نے اپنی سکھیوں کو بھی بلایا ہے۔ کیلاش کے بھی کچھ دوست آئیں گے ذرا ہاتھ منہ دھولو تو تم بھی کچھ کھا پی لو اور یہ دھوتی بھی تو بدلو۔ راستہ میں ساری میلی ہو گئی ہے۔

کلیانی (ہنس کر) راستہ میں کہاں میلی ہوتی۔ گھر کے کام کاج میں دھونے کا سمے نہیں ملتا۔ دوسری تو میلی پڑی ہی تھی۔ یہ دھا آتے آتے میلی ہو گئی۔ میں نے سوچا دھوتی کے لئے دیر کیوں کروں۔ وہاں دھو کر بدل لوں گی۔

مہابیر (بگڑ کر) تم کپڑے دھوتی ہو؟

کلیانی (ہنس کر) اسے تو اس میں کیا ہو گیا۔

بملا۔ یہ کام تو کبھی میں نے بھی نہیں کیا اور تم تو بڑے گھر کی لڑکی ہو۔

کلیانی۔ گھر بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنے گھر کا کام تو آدمی کو کرنا ہی پڑتا ہے۔

مہابیر (ناراضگی سے) میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تمہیں راج منڈلی میں پڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے جو تم وہاں رہ کر یہ بپتائیں اٹھاؤ۔ یہاں رہنے میں تمہیں کشٹ ہوتا ہے؟ یہ اتنا بڑا گھر ہے۔ کام کرنے کو نوکر ہیں۔۔۔

کلیانی۔ میری تو وہاں بھی گذر ہو ہی جاتی ہے۔

مہابیر۔ اوہو۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن اب تو وہاں زمینداری کی دولت یا ٹھٹ باٹ بھی نہیں رہا جس کا تم بہانہ کرتی تھیں

کلیانی (احتجاج) میں نے کبھی بہانہ نہیں کیا!

مہابیر۔ اچھا! اچھا! لیکن اب وہاں کیوں رہتی ہو؟

کلیانی۔ مجھے تو وہاں کوئی دکھ نہیں

مہابیر۔ مجھ سے تو تمہاری یہ بپتا دیکھی نہیں جاتی۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بہن ایسی میلی دھوتی باندھے۔

کلیانی۔ میری سمجھ گیا ہے کہ آپ کو میرا اتنا دھیان ہے۔

مہابیر۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے جان بوجھ کر دکھ پہنچاؤ۔

کلیانی۔ بھیا میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی میرا بوجھ اٹھائے

مہابیر۔ تمہیں اپنی آن کا خیال ہے۔

کلیانی (دکھی ہو کر) آن تو اسی دن ختم ہو گئی تھی جس دن ودھوا ہوئی تھی۔ تمہارے پاس اس لئے آئی تھی کہ تمہارے سہارے میں بھی دیش کی کچھ سیوا کروں اور اپنا یہ جیون بتا دوں۔ سو یہ بھی نہ ہو سکا۔ پا ٹھ شالہ زمینداری کی بھینٹ گئی۔ میرے جیون کی کوئی سادھنا پوری نہیں ہوئی۔ اب بیٹی ہی ہو۔ مجھے یہ جیون بتا لینے دیجئے۔

مہابیر (ناراضگی سے) جو تمہارے من میں آئے کرو۔ مجھ سے کیا کہتی ہو (اندر چلا جاتا ہے)

کلیانی۔ بھیا ناراض ہو گئے!

کملا۔ تم چنتا نہ کرو۔ چلو اندر چلو۔

کلیانی۔ اچھا چلو۔

(کملا اور کلیانی اندر چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد گوپی ناتھ اور ننھو اندر آتے ہیں)

گوپی ناتھ۔ تو تو مورکھ ہے ننھو۔ میں کہہ جو رہا ہوں، سب کچھ واپس مل جائے گا۔ زمین، مویشی، اناج سب کچھ واپس مل جائے گا۔ میں زمیندار جی سے کہہ کر نیا گھر بنوا دوں گا اور کچھ نقد روپیہ بھی دلوا دوں گا۔ سمجھا! (آہستہ سے) روپیہ میں بارہ آنے تیرے اور چونی میری! (اونچی آواز میں) بس تو ہو گئی بات پکی!

ننھو۔ میں نہ جانوں یہ سب بات۔ بابو جی سے بولو نا!

گوپی ناتھ۔ ارے بات میں تجھ سے کر رہا ہوں۔ بابو جی سے کیا بولوں گا؟

ننھو۔ مجھ سے ایسی بات نہ ہو گی۔

گوپی ناتھ۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔ تو اپنا جی کیوں میلا کرتا ہے۔ میں وچن دیتا ہوں کہ اب آگے ایسی ویسی بات نہیں ہو گی۔ بس!

ننھو (آواز دیتے ہوئے) بابو جی۔ . . . اجی بابو جی!

گوپی ناتھ۔ مورکھ کہیں کا

(مہابیر اندر سے نکلتا ہے)

مہابیر۔ کیا ہے ننھو؟ (گوپی ناتھ کو دیکھ کر) اوہو آپ۔ آپ آئے ہیں گوپی ناتھ جی۔

گوپی ناتھ۔ نمستے مہاراج

ننھو۔ بابو جی۔ گوپی ناتھ جی کہتے ہیں کہ آپس میں فیصلہ کر لو۔

گوپی ناتھ۔ ہاں ہاں مہاراج ذرا سوچئے تو اگر فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہی ہے نا؟

مہابیر۔ دو شرطوں پر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

گوپی ناتھ۔ دو کیا دو سو شرطیں بھی پورا کر دوں گا۔ مہاراج

مہابیر۔ پہلی شرط یہ کہ ڈھول کی آواز کے ساتھ ساری زمینداری کو خبر سنوانی ہو گی کہ زمیندار جی نے ننھو کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ دوسری شرط یہ کہ اب تک ننھو کو جتنی ہانی ہوئی ہے۔ اس کو پورا کرنا ہو گا۔

گوپی ناتھ۔ دوسری بات کی تو آپ کچھ چنتا نہ کریں مہاراج۔ میں زمیندار جی سے کہہ کر ننھو کو کچھ اور انعام بھی دلوا دوں گا پر مہاراج پہلی شرط۔ . . . (خاموش ہو جاتا ہے)

مہابیر۔ اس کے بنا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا!

گوپی ناتھ۔ ذرا سوچئے تو مہاراج۔ اس شرط سے نہ تو ننھو کا کچھ بھلا ہو گا نہ کسی اور کا۔ اور زمیندار جی کو بیٹھی کرنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ پرماتما نے انہیں دھن مان سکھ دے کر جو بڑائی دی ہے۔ اسے ننھو کے سامنے چھوٹا کرنے

سے کیا بھلا ہوگا۔ آپ ایسی شرط مت لگائیے۔

مہابیر (غصّہ سے) میں کہہ چکا ہوں۔ شرط پوری کئے بنا کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ اگر فیصلہ کرنا ہے تو یہ شرط پوری کرنی ہوگی۔ سمجھے!

گوپی ناتھ۔ آپ تو غصّہ ہو جاتے ہیں مہاراج!

مہابیر۔ غصّہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ زمیندار جی فیصلہ بھی کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ بیٹی نہ ہو۔ چپکے سے فیصلہ ہو جائے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو کہ زمیندار جی نے ہار مان لی اور سب کی نظروں میں .. اتنے ہی بڑے بنے رہیں جتنے بڑے وہ میرے گھر کے آگے ڈھول بجوا کر ہوئے تھے۔ انہیں اپنے مان کا خیال ہے۔ پہلے میرے مان کا خیال نہیں ہوا تھا۔ پاٹھ شالہ کو آگ لگوائی تھی۔ اس وقت نہ سوچا کہ پاٹھ شالہ مہابیر کی ہے۔ نتھو کو نشٹ کر کے زمیندار جی نے طمانچہ تو مہابیر کے منہ پر مارا تھا۔ اب چپکے سے نتھو کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو کہ زمیندار جی پر کیا بیتی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ جائیے گوپی ناتھ جی جائیے۔ یہ نہیں ہوگا۔

گوپی ناتھ۔ (گھبرا کر) نمستے۔

پانچ سال بعد:۔

ضلع میں مہابیر پرشاد کی نئی کوٹھی

کوٹھی میں ملاقات کا کمرہ۔ کمرہ بڑے قیمتی سامان سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف بیچ میں کا صوفا سیٹ ہے اور فرش پر ایک بہت قیمتی قالین۔ دیوار پر سجاوٹ کے لئے کچھ تصویریں ہیں۔ کمرے کے بیچ میں ایک گول میز ہے۔ صوفہ کے پہلو میں چھوٹی تپائیاں بھی ہیں اور اسی قسم کا جملہ سامان۔ دروازوں پر پردے ہیں۔ دائیں طرف دروازہ باہر برآمدہ میں کھلتا ہے۔ بائیں جانب کا دروازہ برابر والے کمرے میں لے جاتا ہے۔ پچھلا دروازہ گیلری کو جاتا ہے۔ اس پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔

مہابیر پرشاد کی عمر اب اڑتالیس سال ہے اور چہرے سے سنتوش ظاہر ہوتا ہے۔ مہابیر پرشاد ابھی باہر سے آئے ہیں۔ ٹوپی اتار کر بیچ کی گول میز پر رکھ دیتے ہیں اور خود ایک بڑے صوفا کی طرف بڑھتے ہیں

مہابیر۔ اوہو! آج تو میں بہت تھک گیا ہوں (صوفے پر نیم دراز ہو جاتے ہیں اور آواز دیتے ہیں) ارے کوئی ہے!

نوکر (داخل ہو کر) جی حضور!

مہابیر۔ آج کا اخبار کہاں ہے؟

نوکر۔ ابھی لایا حضور (وہ چلا جاتا ہے)

مہابیر۔ یہ نہیں کہ پہلے سے لا کر رکھ دیا کریں!

نوکر (داخل ہو کر) یہ لیجئے حضور! (گھنٹی بجتی ہے)

مہابیر۔ دیکھو باہر کون ہے؟

نوکر۔ بہت اچھا حضور (نوکر جاتا ہے اور چند لمحہ بعد واپس آتا ہے) ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔ یہ کارڈ دیا ہے۔

مہابیر (کارڈ دیکھ کر) اندر بھیجو انہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے اور چند لمحہ بعد دائیں جانب سے راجندر ناتھ داخل ہوتے ہیں۔ پچپن سال کے قریب عمر ہوگی۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ لباس بہت اچھا ہے۔ مہابیر پرشاد سواگت کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے)

مہابیر۔ آئیے راجندر ناتھ جی۔ تشریف لائیے۔۔ یہاں۔ یہاں۔ اس صوفے پر۔۔۔ آپ نے کیوں آنے کا کشٹ کیا۔

راجندر ناتھ۔ آپ سے ملے ایک مدت بیت گئی تھی۔ بہت دن سے سوچ رہا تھا۔۔۔ آپ جانیں بڑھاپا ہے۔۔۔

مہابیر۔ آپ نے مجھے کہلوا دیا ہوتا۔ میں فوراً آپ کی سیوا میں حاضر ہوتا۔

راجندر ناتھ۔ میں ہردوار گیا ہوا تھا۔ آئے ابھی چار پانچ ہی دن ہوئے ہیں۔ یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے نئی کوٹھی بنوائی ہے۔ کوٹھی تو بہت اچھی ہے (ہنس کر) روپیہ بھی تو اتنا ہی لگا ہوگا۔

مہابیر۔ جی ہاں۔ میں نے بھی سوچا کہ عمارت تو ایک ہی دفعہ بنوائی جاتی ہے ایک دفعہ روپیہ لگا کر ڈھنگ کی چیز بنوالوں۔

راجندر ناتھ۔ ہاں ہاں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ اور اب آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو ایسی کوٹھی بہت شوبھا دیتی ہے

مہابیر۔ آپ جانیں مجھے تو ایسی باتوں کا کبھی خیال ہوتا نہیں ہے۔ موقعہ سے زمین مل گئی تھی۔ اس لئے کوٹھی بنوالی۔

راجندر ناتھ۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور ہاں آپ کا بڑا لڑکا کیلاش بھی تو بی۔ اے کے امتحان میں اول آیا ہے۔

مہابیر۔ جی ہاں

راجندر ناتھ۔ کیوں نہ ہو۔ بھاگیہ کی بدھی لوٹ میں آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس سارے ضلع میں آپ جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے قابلیت میں، ودیا میں، بدھی میں، آدر میں آپ کا کوئی پاسنگ بھی نہیں ہے۔

مہابیر (ہنس کر) آپ کو ایسی باتیں شوبھا نہیں دیتیں۔ آپ کے ہوتے میں بھلا کیا چیز ہوں۔ آپ میرے بڑے ہیں۔

راجندر ناتھ۔ بڑائی اپنی جگہ رہی۔ لیکن آپ کی بڑائی اپنی جگہ ہے۔ یہ آپ کے گن ہی تو تھے جو آپ کے الیکشن میں وجے ہوئی

مہابیر (ہنس کر) وجے تو اُن کی ہوئی جنہوں نے مجھے ووٹ دیئے۔ میری وجے تو یہ ہے کہ لوگوں کو مجھ پر اتنا وشواش ہوا کہ انہوں نے مجھے اپنی سیوا کے لئے چُنا۔

راجندر ناتھ۔ آپ پر وشواش نہ ہوگا تو پھر کس پر ہوگا۔ اتنی عمر آپ نے دیش کی سیوا کی ہے۔ دیش کو آپ جیسا سیوک اور کون ملے گا۔

مہابیر۔ میں بھلا کیا سیوا کر سکتا تھا۔ یونہی کچھ تھوڑا بہت کرتا رہتا تھا۔ اسی کو سیوا سمجھ لیجئے۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔ میرا اپنا ہی لڑکا کیلاش وہی جو اس سال بی۔ اے میں فرسٹ آیا ہے۔ اسے بھی کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے الیکشن میں میری کچھ سہائتا نہیں کی

راجندر۔ لڑکے کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ بیاہ کر دیجئے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا

مہابیر۔ اب تک تو بیاہ تو کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جب تک دیش کی کچھ سیوا نہیں کر لوں بیاہ نہیں کروں گا۔

راجندر (ہنستا ہے) اور آپ اس کی بات میں آ گئے۔ لڑکے بالے تو ایسی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے۔ بیاہ کی بات کہیں ٹھیک بھی کر لی ہے نا!

مہابیر۔ ہاں کچھ ہو تو گئی ہے۔ بہت ورش ہوئے میری پتنی نے بات ٹھیک کر لی تھی۔

راجندر۔ کہیں وہیں تو نہیں۔ وہ جو ہے نا راج منڈلی میں پاٹھ شالہ . . . اس میں جو لڑکوں بالوں کو پڑھایا کرتی تھیں . . . ابھی ایک دو دن کی بات ہے کہ وہاں میرے برابر میں جو جگل کشور جی رہتے ہیں۔ ان کے ہاں وہ ہاتھ کے بنے ہوئے میز پوش، پلنگ پوش، چادریں اور اسی طرح کی کچھ چیزیں بیچنے لائیں . . . . بچاری ودھوا ہیں سنا ہے ان کی لڑکی کی آپ کے ہاں بات ہوئی تھی . . . . میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔

مہابیر۔ جب کیلاش چھوٹا سا تھا۔ اس وقت میری پتنی نے بات کی تھی۔ آپ جانیں اس سمے کی بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔

راجندر ناتھ۔ نہیں نہیں جی۔ وہ بھی کوئی آپ کے میل کا رشتہ ہے۔ اگر آپ کو کہیں ڈھنگ کی جگہ رشتہ کرنا ہو تو میں بتاؤں۔ آپ کے میل کا رشتہ ہوگا۔ اس سارے علاقہ میں ایک ہی جگہ ہے جہاں آپ رشتہ کر سکتے ہیں۔ بڑا گھر ہے۔ بہت دھن ہے . . . بہت مان ہے . . . .

(بائیں جانب سے ننھو داخل ہوتا ہے)

ننھو۔ بابو جی!

مہابیر (ناگواری سے) کیا ہے؟

ننھو۔ آپ کی بہن جی آئی ہیں ان کے ساتھ میں بھی آیا تھا پرنام کرنے۔

مہابیر۔ کون؟ . . . . کلیانی!

ننھو۔ جی ہاں۔ بابو جی!

مہابیر۔ اچھا تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

ننھو۔ اچھا۔

راجندر ناتھ۔ یہ وہی کسان ہے جس کے لئے آپ نے راج منڈلی کے زمیندار ٹھاکر داس جی کے ساتھ مقدمہ کیا تھا؟ . . . (ہنستا ہے) اوہو میں نے آپ کے سب سے بڑے کرتو یہ پر آپ کو ودھائی دی ہی نہیں۔ زمیندار ٹھاکر داس جی کو آپ نے بتا دیا کہ پاپ کا پراسچت کیسے ہوتا ہے۔

مہابیر۔ پراسچت سے آدمی کی آن کم نہیں ہوتی۔ بلکہ مان زیادہ ہوتی ہے۔ اگر زمیندار جی خود اپنا انیائے جان لیتے اور ننھو کے ساتھ فیصلہ کرا لیتے تو اُن کی شوبھا بڑھ جاتی۔

راجندر ناتھ۔ میں ابھی راج منڈلی سے آ رہا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں زمیندار جی سے میرا بچپن کا میل جول ہے۔ وہ مجھ سے اپنے من کی بات کبھی کبھی کہہ دیتے تھے۔ جب میں وہاں سے آنے لگا تو کہنے لگے کہ مہابیر پرشاد سے میرا پرنام کہنا۔ ورنہ ٹھاکر داس جی کے من میں آپ کی طرف سے کوئی میل نہیں ہے۔

مہابیر۔ ٹھاکر داس جی بہت بڑے ہیں جب . . . اُن کے من میں میل نہیں تو میرے من میں میل کیسے ہو سکتا ہے اور اب

پجرے پتا کے سمان ہیں۔

راجندر ناتھ۔ ٹھاکر داس جی کو اس کا بڑا دکھ ہے کہ آپ نے کبھی اپنے من کی بات ان سے نہیں کہی۔ وہ تو آپ کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ اگر آپ ایک دفعہ ان سے کہدیتے تو آپ دیکھتے کہ مقدمہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ زمیندار جی من کے بہت اچھے ہیں اور دوسرے کا گن بہت مانتے ہیں۔ آپ کی تعریف بہت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سارے علاقے کی شوبھا دھابیر پرشاد جی کے نام سے ہے۔

دھابیر۔ یہ تو ان کی دیا ہے۔ ورنہ بات تو یہ ہے کہ میں ان کی کچھ بھی سیوا نہ کر سکا۔ کچھ دکھ تو ضرور دیا ہے۔ اگر اب میں کچھ بھی ان کی سیوا کر سکوں تو من کو بہت شانتی ہو۔

راجندر۔ ٹھاکر داس جی نے مجھے آپ کے پاس ایک کام کے لئے بھیجا ہے

دھابیر (خوش ہو کر) بتائیے!

راجندر۔ زمیندار جی اپنے لڑکے کو وکالت پڑھوانا چاہتے ہیں۔ اس نے ابھی اسی سال بی۔ اے کیا ہے

دھابیر۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔

راجندر۔ زمیندار جی چاہتے ہیں کہ وکالت کی پڑھائی کی دیکھ بھال آپ اپنے ذمہ لیں اور اگر اس کا رشتہ بھی آپ کے ہاں ہو جائے تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آپ کی بڑی لڑکی کی ابھی بات بھی کہیں نہیں ہوئی ہے اور میرے خیال میں آپکے گھر اور ان کے گھر کا میل بھی بہت اچھا ہے۔

دھابیر (ہنس کر) اچھا۔ زمیندار جی میری بیٹی تو مانگ رہے ہیں۔ مجھے کیلاش کے لئے اپنی لڑکی بھی دے دیں گے؟

راجندر۔ آپ چاہیں اور وہ نہ دیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے (ہنستا ہے) آپ آج ہی شام کو راج منڈلی آکر لڑکی کو دیکھ لیجئے۔ اگر آپ پسند کریں تو بس بات ہوئی سمجھئے!

دھابیر۔ میں آج ہی شام کو آؤں گا!

راجندر۔ ضرور! . . . . اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے۔

دھابیر۔ بہت اچھا۔ زمیندار جی سے میرا پرنام کہئے

راجندر۔ وہ آپ کا انتظار کریں گے۔

(راجندر ناتھ دائیں جانب کے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

دھابیر (آواز دیتا ہے) نتھو!

نتھو (پیچھے سے آواز) کیا ہے بابو جی! (اندر آتا ہے)

دھابیر۔ تم کہہ رہے تھے کلیانی آئی ہیں؟

نتھو۔ جی ہاں۔ بیوی جی سے باتیں کر رہی ہیں۔

دھابیر۔ ذرا ان کو یہاں بھیج دو۔ [illegible] انتظار کر رہا ہوں

نتھو۔ اچھا!

(نتھو پیچھے کے دروازہ سے گیلری میں جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسی دروازہ سے کلیانی آتی ہے)

کلیانی۔ کیا ہے مہابیر بھیا؟

مہابیر۔ سنو کلیانی۔ اب تمہیں یہ سب باتیں چھوڑنی پڑیں گی۔

کلیانی (حیرت سے) کیا باتیں؟ .... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مہابیر۔ غریبی کو میں برا نہیں سمجھتا۔ یہ تو بھی بانتی ہو۔ لیکن یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں کہ تم ہاتھ کے بنے کپڑے بیچو اور لوگ دیا سے تمہیں زیادہ دام دیں۔ یہ دان ہے جس سے غریبی نشٹ ہوتی ہے۔ ایسی غریبی مہا پاپ ہے۔

کلیانی۔ کچھ اور کہنا ہے؟

مہابیر (سختی سے) تمہیں بس کا اتر دینا ہوگا۔

کلیانی۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتی

مہابیر۔ سوچ لو کلیانی۔ اس سے تمہارا ہی اپمان نہیں ہوتا میرا اپمان زیادہ ہوتا ہے۔

کلیانی۔ میری غریبی سے آپ کو لجیا آتی ہے۔

مہابیر۔ تمہاری ان نیچ باتوں سے!

کلیانی۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مجھے لاج آئے۔ اپنی محنت سے روزی پیدا کرتی ہوں۔ محنت کی روزی چھوڑ کر کسی کے کرتگیہ اور احسان پر جیسے لاج آئے گی۔

مہابیر آج سے میرا تمہارے ساتھ کوئی سمبندھ نہیں

کلیانی۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

مہابیر۔ ٹھیرو یہ لیتی جاؤ... (بائیں جانب کے دروازہ سے برابر والے کمرے میں جاتا ہے اور ایک پوٹلی لاتا ہے، سادھنا کا زیور جو تم نے میرے پاس رکھوایا تھا... سنبھال لو اچھی طرح سے۔

کلیانی (احساس سے) کیا اب یہ بھی سنبھالنا ہوگا۔

مہابیر۔ اور ہاں۔ میں سادھنا کے بیاہ کے لئے کچھ دینا چاہتا تھا۔ تم وہ ابھی لے جاؤ (جیب میں سے نکال کر نوٹ گنتا ہے) جب کبھی اس کا کہیں بیاہ کرو۔ میری طرف سے دے دینا... ایک ہزار روپیہ۔

کلیانی (یکر واپس دیتے ہوئے) جب کبھی کیلاش کا کہیں بیاہ ہو۔ میری طرف سے اُسے دے دیجئے گا۔ پرنام!

(پیچھے کے دروازہ سے جلدی سے چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بملا روتی ہوئی آتی ہے)

بملا۔ اجی سنتے ہو؟

مہابیر (غصہ سے) کیا ہے؟ .... کیوں رو رہی ہو؟

بملا۔ کلیانی بہن سادھنا کو لے کر واپس جا رہی ہیں۔

مہابیر۔ جانے دو انہیں بملا! وہ اب یہاں نہیں رہ سکتیں!

بملا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

مہابیر۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ ہی ہوگا۔

بملا۔ تم سادھنا کو بھی نکالے دیتے ہو؟

مہابیر۔ میں کیلاش کے لئے ایک اور جگہ ٹھیک کر رہا ہوں بڑی اچھی جگہ ہے جب تم سنو گی تو . . .

بملا۔ (شدت سے) میں کچھ نہیں سن رہی . . . میں نہیں سنتی کچھ . . .

مہابیر (تنبیہہ) بملا!

(بملا روتی ہوئی پیچھے کے دروازہ سے جلدی سے چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد نتھو آتا ہے)

نتھو۔ بابو جی!

مہابیر۔ نتھو! آ آ . . تو نے سنا نتھو، زمیندار جی کی لڑکی کے ساتھ کیلاش کی بات . . .

نتھو (بات کاٹ کر) میں جا رہا ہوں بابو جی!

مہابیر۔ ابھی نہ جا . . . شام کو بیٹا مجھے بھی تو راج منڈلی جانا ہے زمیندار جی سے ملنے . . تو بھی میرے ساتھ چلیو۔

نتھو۔ نہیں!

مہابیر۔ زمیندار جی تیری بہت خاطر کریں گے تو دیکھیو تو . . .

نتھو۔ مجھے نہ چاہیو یہ سب کچھ۔ میں تو بہن جی کو لے کر اسی سمے واپس جا رہا ہوں۔ منتے!

(بائیں طرف کے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

مہابیر (آواز دیتے ہوئے) نتھو! . . . نتھو!!

(پیچھے کے دروازے سے کیلاش آتا ہے)

کیلاش۔ وہ چلا گیا پتا جی!

مہابیر۔ ذرا اسے بلاؤ تو کیلاش!

کیلاش۔ وہ اب نہیں آئے گا . . . آپ نے کلیانی بوا کو . . .

مہابیر (غصہ سے بات کاٹ کر) میرا اب کلیانی سے کوئی سمبندھ نہیں۔

کیلاش۔ آپ نے انہیں چھوڑ دیا۔

مہابیر۔ ہاں! ہاں!! ہاں!!! اور میں اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔

کیلاش۔ میں آپ سے کچھ کہوں گا بھی نہیں۔ مجھے آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے۔

مہابیر۔ کیا؟

کیلاش۔ آپ میرے بیاہ کی بات راج منڈلی کے زمیندار ٹھاکر داس کی لڑکی سے کر رہے ہیں؟

مہابیر۔ ہاں!

کیلاش۔ بات کرنے سے پہلے آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا۔

مہابیر (غصہ سے) کیلاش!

کیلاش۔ میں آپ کا اپمان نہیں کر رہا۔ اپنے جیون پر سب سے پہلا ادھیکار میرا ہے۔ جیون میں بیاہ بہت بڑی چیز ہے اگر میں اس میں دخل نہ دوں تو جیون پر میرا ادھیکار ہی کیا ہوا!

مہابیر۔ یہاں اس گھر میں سب سے پہلا ادھیکار میرا ہے اور میرے ہر آدیش کا پالن کرنا ہوگا!

کیلاش۔ لیکن پتاجی وواہ نہیں کر سکتا۔

مہابیر۔ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتے ہو! جسے میں نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے تمہیں اسے بیاہ کر گھر میں لانا چاہتے ہو

کیلاش۔ اس گھر پر ادھیکار آپ کا ہے۔ لیکن بیاہ کرنے کا ادھیکار میرا ہے۔

مہابیر۔ نہیں میری آگیا کا پالن کرنا ہوگا کیلاش!

کیلاش۔ آپکے آدرش کے پالن کرنے سے زیادہ اپنے ادھیکار کا رکھشا کرنا میرے لئے ضروری ہے۔

مہابیر (غصّہ سے) کیلاش!

کیلاش۔ مجھے آگیا دیجئے۔ میں جا رہا ہوں!

مہابیر (حیرت سے) کہاں؟

کیلاش۔ اس گھر سے باہر..... اپنے ادھیکار کے رکھشا کے لئے۔

مہابیر۔ تم جانتے ہو۔ تم کیا چھوڑ کر جا رہے ہو۔ .. کیا تم اپنے پتا کو چھوڑ کر جا سکتے ہو؟

کیلاش۔ ہاں! میں آپ کو پتا سے زیادہ ایک دیش سیوک سمجھتا ہوں۔ آپنے مجھے بتایا تھا کہ جیون میں سب سے بڑی چیز ادھیکار ہے اور اس کی رکھشا کرنا جیون کی سب سے ضروری چیز ہے۔ میں اب اسی کی رکھشا کے لئے پتا کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔

مہابیر۔ تم مجھے پاپی سمجھتے ہو؟

کیلاش۔ یہ آپ کے سمجھنے کی بات ہے۔ اچھا پرنام!

مہابیر۔ تمہیں اپنی ماں کا بھی خیال نہیں۔

کیلاش۔ ماتا جی تو پہلے ہی کلیانی بوا کے ساتھ چلی گئی ہیں۔

(جلدی سے دائیں جانب کے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

مہابیر (حیرت سے) بملا کلیانی کے ساتھ چلی گئیں.... (بلاتے ہوئے) کیلاش!... کیلاش!! (جواب نہ پاکر) چلے گئے تم!... بملا بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ .. نتھو بھی چلا گیا... سب چلے گئے... مجھے چھوڑ کر چلے گئے سب!.... (شدتِ احساس سے چیخ کر) میں پاپی ہوں!.... پاپی!!.... ارے کوئی ہے؟... یہ نوکر سب کہاں چلے گئے.....

نوکر۔ جی سرکار!

مہابیر۔ میرا منہ کیا تک رہے ہو... جاؤ.... دوڑ کر جاؤ اور ان سب کو واپس بلا لاؤ... (چیخ کر) جاؤ.... (غم سے بے تاب ہو کر) پرماتما کے لئے جاؤ انہیں واپس بلا لاؤ....

نوکر۔ (متعجب) جی سرکار! (جلدی سے باہر چلا جاتا ہے)

مہابیر۔ نوکر کے بلائے نہیں آئیں گے... میں نے سب کا اپمان کیا ہے۔ میں خود جا کر واپس لاتا ہوں... (آواز دیتے ہوئے دروازے کی طرف جاتا ہے) کلیانی!.... نتھو!.... کیلاش!.... بملا!!... بملا!!! (ایک صوفے سے ٹکرا کر گرتا ہے۔ کچھ دیر منہ اوندھائے پڑا رہتا ہے۔.. پھر سر اٹھاتا ہے... بالکل مایوس ہے)

... اب کوئی نہیں آئے گا! (پھر سر اوندھا کر پڑ جاتا ہے) (پردہ)

انور جلال

ماورائے

میں زندگی کے مہیب صحرا کی وسعتوں میں بھٹک رہا ہوں

یہاں کوئی آفتاب تازہ نہیں جو مجھ کو سحر کے رنگِ جمیل سے ہمکنار کر دے

کہیں نہیں ماہتاب سیمیں

جو اپنی شفاف چاندنی کی ردائے نرم و حسین و نازک سے ڈھانپ لے میری تیرہ بختی

مرے جہاں میں کوئی ستارہ نہیں جو چمکے، چمک کے لرزے، لرز کے ٹوٹے،

مرے جہاں میں فلک نہیں ہے جہاں کوئی آفتاب ابھرے، کوئی حسین ماہتاب نکلے، کوئی ستارہ چمک کے لرزے، لرز کے ٹوٹے

یہاں پہ تاریکیاں مسلط ہیں ایک بہیم جمود بن کر،

میں زندگی کے مہیب صحرا کی وسعتوں میں بھٹک رہا ہوں

یہاں پہ اشجار ہیں نہ پودے جو سرسرائیں ہوا کے جھونکوں سے اور سرگوشیاں بکھیریں

یہاں کہیں طائرانِ رنگین و خوش نوا بھی نہیں جو چہکیں، چہک کے خاموشیوں کو توڑیں

کہیں نہیں آبشار سیمیں، نہ کوئی ندی نہ کوئی نالا جو گنگنا کر لگائیں دل میں حسین و رقصندہ زندگی کا۔

مرے جہاں میں زمیں نہیں ہے، جہاں پہ اشجار سرسرائیں یا آبشاریں ہی گنگنائیں یا طائرِ خوش نوا ہی چہکیں، چہک کے خاموشیوں کو توڑیں

یہاں مسلسل سکوتِ مائم ہے، اک تسلسل ہے خامشی کا۔

میں زندگی کے مہیب صحرا کی وسعتوں میں بھٹک رہا ہوں!

مختار صدیقی

بوئے رفتہ°

پاس کیا ہے فقیروں نے بھی کبھی کبھار بہاروں کا
ورنہ خوش رہنا خوش رکھنا کام ہے دنیا داروں کا

پیر فقیر اوراد و وظائف اس بارے میں عاجز ہیں
ہجر و وصال کے باب میں اب تک حکم چلا ہے ستاروں کا

صبر و قرار، تو وہم و گماں تھے ہوش و خرد افسانہ ہوئے
عشق کا نام، نشاں مٹ ٹے، کیسے کارگذاروں کا

دل ہی کے دم تک مر مر کے جینے کے سارے جھگڑے تھے
ہائے قصہ پاک ہوا ہے جھوٹے سچے سہاروں کا

تیری لگن کی لاگ کے ہاتھوں ہم بے چین کمال ہوئے
جتنے ارماں جی میں رہے وہ اپنے جی کا وبال ہوئے

ہم تو خوش ہیں یہ دن آیا غیر کے کہنے سُننے سے
اُن کو ہمارے بارے میں بھی کیسے کیسے خیال ہوئے

آج کی بات نہیں ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
جوں توں رات گذاری لیکن دن کو سوا بہحال ہوئے

شانِ خدا ہے آج زمانہ آیا ہم بے ہنروں کا
ورنہ اس بستی میں بھی کیا کیا اہلِ کمال ہوئے

° زیر ترتیب مجموعہ۔

مظفر

ایک خط

گوردیپ! پیارے گوردیپ!

آج ہی دو خط ملے، ایک ساگر کا، امرتسر سے، اور تمہارا پریت نگر سے۔ ساگر لکھتا ہے: "اپنی جدید فارسی کے بل بوتے پر ایران جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔ اگر نہیں جانا چاہتے تو لاہور میں مت رہو۔" دوستی کے واسطے دیئے ہیں۔ دھرم کی سوگند کھائی ہے۔ کہ لاہور میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مگر شاید ایسا نہیں اس کا یہ فعل کسی حد تک حماقت پر مبنی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں رہوں گا لاہور ہی میں۔ مجھے گو وطن سے محبت نہیں مگر اِل وطن سے تو ہے۔ اس نے شاید یہ سمجھا ہوگا۔ کہ میری جذباتیت پر وہ غالب آ کر اپنے وطن کی فوجوں کو راستہ صاف کرنے میں مدد دے سکے گا ــــ کیسے، شاید تم پوچھو ــــ میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، میں نے اس کی شخصیت کا تجزیہ کر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے ــــ اس کا خیال ہے کہ میں اپنے ماحول میں کافی ممتاز حیثیت رکھتا ہوں۔ اور اس کی لاہور چھوڑ دینے کی رائے کو تقویت دیتے ہوئے اسے اپنے ماحول میں آگ دوں گا اور لوگ جن میں بھیڑ چال بقول اس کے بھیڑوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح لاہور کو خطرے میں سمجھ کر خالی کرتے جائیں گے۔ تم کہو گے، حماقت ہے۔ میں اسے کمینگی کہہ سکتا ہوں ــــ مگر نہیں، انسان طبعاً کمینہ ہے میں کس کس کو کمینہ کہوں!

تم آج کل پریت نگر میں ــــ پریم کے دیس میں، جہاں انسانیت ہی انسانیت ہے، جہاں کوئی مذہب نہیں، وہ جہاں کے تعلیم پانے والوں کو بے دین کہا جاتا ہے۔ جہاں کی لڑکیوں کو لارنس کی تعلیم ضلع امرتسر کے ایک دور افتادہ گاؤں ہی میں مل جاتی ہے۔ جو ہند پاکستان سرحد سے بہت قریب ہے۔ جہاں اقبال سلمانی سوبھا سنگھ، اپندر ناتھ اشک اور گوربخش سنگھ رہ چکے ہیں۔ جہاں کی کوٹھیاں لاہور کی یاد دلاتی ہیں۔ جہاں کی پگڈنڈیاں زندگی کی طرح اب بھی طویل ہیں ــــ اور جہاں ایک مسلمان وکیل کی لاج میں تم مقیم ہو ــــ کیوں غلط تو نہیں؟

تم کہتے ہو دھیان خانخاناں چھوڑنے کے بعد سے تم غمگین سے ہو۔ اپنا گاؤں یاد آ رہا ہے، خانخاناں کا محل۔ ــــ اس کی خواب آلود شامیں! نہیں ــــ نہیں! انارکلی! ہاں! نیو ہوسٹل! ــــ اپنی جاگیرداری! اپنے سردار جی کی مجسٹریٹی ــــ! شاید نہیں۔ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تو تمہیں کبھی کچھ یاد نہ تھا۔ اب کیوں ــــ؟ تم کبھی اداس نہیں ہوتے تھے مگر اب زندگی سے بیزار کیوں ہو؟

وہ خوشگوار لمحے تو یاد نہیں آتے۔ جب ہم سب اکٹھے تھے، بھرپور قہقہے جو میرے شعر پر بے ساختہ بکھر آئے تھے۔ یہ ستم ظریفی اور قرب تو بیزاری ہیں ــــ تم کو یک سے بھی کچھ ہے جو ریڈ کلف کمیشن نے تقسیم نہیں کیا، یہی کچھ ہے جسے ہم یاد رکھ کر بیزار دلوں کو تسلی دے سکتے ہیں ــــ!

میں نہیں آتے تھے۔ روز کئی کئی مرتے تھے۔ مگر ان کی گنتی کم ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ جس طرح بکریوں اور بھیڑوں کی گنتی ذبح کرنے سے کم نہیں ہوتی۔ مگر وہ تو بھیڑیں بھی نہیں تھیں اس لئے کہ ہر بھیڑ ذبح نہیں کی جاتی، پٹھورے اور بیلے تو نرم گوشت کے لئے رغبت سے ذبح کر لئے جاتے ہیں مگر مادہ بھیڑوں کو کوئی ذبح نہیں کرتا۔ شکستے گوشت والے بڈھے جانوروں کو مستثنےٰ کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں سب جائز تھا۔ بچہ، بڈھا، جوان (بال بچوں والا ہو تو ماشاء اللہ) اور بڈھے بوڑھے تو وقت گذاری کے لئے ہیں۔ عورتیں کسی کے ساتھ ہوں تو ذبح کر دو ورنہ گھر لے جا کر خوب خدمت کرو۔ اور اپنی خدمت شعاری کی مہریں انگ انگ پر ثبت کر دو۔

تمہیں شاید خبر ہے کہ میری ایک مدقوق بھابی تھیں، جنہیں لے کر ہم کشمیر آئے تھے۔ تمہیں فسادات کے دنوں میں جب ہمارے محلے پر حملہ ہوا۔ تو ہم انہیں چھوڑ بھاگے اور اسے جانتے ہو کس سینے ٹوریم میں بھیج گیا۔ جہاں سب ٹیبرکلوسس سپیشلسٹوں سے اچھا معالج ہے، جہاں کی ہوا مری سے زیادہ فرحت بخش ہے۔ جہاں شہتوت کی طرح چیڑ کے درخت بلکہ شاخ طوبیٰ سایہ کناں ہے ۔۔۔ انسانی فکر و ذہن کی حسین ترین تخیلی صورت، جسے ہم تم جنّت کہتے ہیں۔

تم نے لکھا ہے۔ تمہارے بھائی کو مسلمانوں قصابوں نے ذبح کرنا چاہا۔ میں کہہ سکتا ہوں میری بھابی کو سکھ درندوں نے مار ڈالا ۔۔۔ مگر نہیں، سکھ اور مسلمان نہیں ۔۔۔ وہ صرف درندے ہیں، درندوں نے تمہارے گونگے بہرے بھائی کے جسم و روح کے تعلق کو مٹانا چاہا اور درندوں ہی نے میری جاں بلب بھابی کا خاتمہ کر دیا اور اپنے چھروں کو ڈس انفیکٹ بھی نہ کیا ۔۔۔ تاکہ نئے مرنے والوں کو کہیں جنّت میں بھی تپ دق نہ ہو جائے ۔۔۔!

دس اگست کی شام کو جب امرتسر میں مسلمان پولیس سے ہتھیار لے لئے گئے۔ تو پس منظر کی تالیوں کی آواز بھی مدھم ہوتے ہوتے فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ اور ہم دبک کر اپنے محلے میں بیٹھ گئے۔ جہاں ہندو کم تھے اور مسلمان زیادہ اور جہاں کے کمزور ہندوؤں کا بچ جانا ہی ہماری کمزوری کی دلیل تھا۔

پولیس کا ہندو سکھ سٹاف گلیوں میں گشت کر رہا تھا۔ ان کے بھاری بھرکم جوتوں کی آواز دل دہلائے دیتی تھی چھوٹے بھائی نے مجھ سے پوچھا "پہلے تو گورے گورے سپاہی آیا کرتے تھے۔ یہ تو جیسے ستہ ہیں۔ کیا اب انگریزوں کا راج ختم ہو گیا ۔۔۔؟"

"ہاں بھیّا، اب کی پندرہ سے انگریز ہندوستان چھوڑ جائے گا۔ اس لئے کہ اب یہاں کے لوگ جاگ اٹھے ہیں۔ انہیں اب بالواسطہ لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اپنا بُرا بھلا خود جان سکتے ہیں۔ اور اپنے حق اپنے اختیار کے لئے خود لڑ بھڑ سکتے ہیں۔ گورے گورے سپاہی اب تمہیں آیا کریں گے۔ یہی کالے کالے ابھی ابھی تنی ہوئی داڑھیوں والے سکھ اور دھب دھب کرتی ہندوستانی فوج ۔۔۔ اب یہی کافی ہیں ۔۔۔!

میں جذباتی بن گیا حالانکہ تم جانتے ہو سطحی سیاسیات سے مجھے کب دلچسپی تھی؟

دھڑام دھڑام ۔۔۔ تڑ تڑ ..... گولیاں اور بم چلنے لگے "ہائے اللہ۔ اب کیا ہوگا"۔ والدہ اور بہنوں نے خواہ مخواہ ڈرنا شروع کر دیا ۔۔۔ گولیاں اور بم بدستور چلتے رہے ۔۔۔

کھانا کھا کر بستر پر لیٹنا چاہتے تھے۔ کہ بھیانک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ مردانہ دھاڑیں اور زنانہ چیخیں ۔۔۔ پھر سب آوازیں دھڑام دھڑام کی آوازوں میں ڈوب کر رہ گئیں۔ ہم سب ڈرنے لگے۔ ابا جان اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے "پٹاخے ہی تو چھوٹ رہے ہیں۔ سمجھو شب برات ہے۔ جاؤ پڑ رہو بستر پر" بھابی تھر تھر کانپنے لگیں "خدایا میرا کیا ہوگا

ہم سب نے اسے دلاسا دیا۔ "فکر مت کرو۔ جہاں تم وہاں ہم"۔ کاش کہ ایسا ہو سکتا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اپنے ہندو ہمسایوں سے کچھ دال مانگی۔ مگر انہوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ پانچ ماہ پہلے جب فساد ہوا تھا۔ اور ہم نے تم سے دال منگوائی تھی۔ تو تم نے اس میں کنکر ملا دیئے تھے۔ جاؤ اب ہم بھی نہیں دیتے دال ——— دو وقت کا راشن گھر میں تھا۔ لیکن روٹیوں نے خوب مزا دیا۔ دن جوں توں گزر گیا، رات بھی کٹنے کو تھی کہ گلی کے نکڑ پر شور ہوا "آگئے آگئے ——— سکھ آگئے ——— !" اور گلی میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ پولیس بھی دھپ دھپ کرتی آگئی۔ مگر گولیوں کی آوازیں چیخوں کی آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تیز تر ہو گئیں ——— والد صاحب ہیں اور کچھ بڑے چھوٹے بھائی بازار کی طرف لپکے۔ کرفیو آرڈر کے باوجود ——— لوگ اسٹیشن کی طرف بھاگ رہے تھے، ایک ہندو نے بالکنی پر سے تادیبا کہا "جاؤ نہیں لوگ راستے میں بھی مر رہے ہیں" اور یہ کہتے ہوئے ایک بم ہم پر دے مارا ——— گری نیڈ تھما دینے والوں نے اسے چلانا بھی سکھا دیا ہوتا تو ہماری خیریت کہاں تھی پھر گھر کو پلٹے اور ۔ ۔ ۔ اور

والد صاحب نے نوٹوں کی گڈی سنبھالی۔ والدہ نے زیورات کس کر کمر سے باندھ لئے، بھائیوں نے بھی جلدی میں کچھ چیزیں لے لیں۔ میں نے اقبال۔ ٹیگور۔ گورکی اور کرشن چندر چن لئے۔ بھابی سے کہا "ہم ابھی آتے ہیں، تمہیں کچھ سامان کے ساتھ لے چلیں گے"۔ بھابی نے حسرت سے کتابوں، زیورات اور دوسری چیزوں کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو "تمہارے لئے تو مجھ سے زیادہ، ان چیزوں کی وقعت ہے۔ بھیا نے گھور کر دیکھا۔ ان کی بھیگی نگاہیں کہہ رہی تھیں "دیکھتی نہیں، کچھ بھی تو نہیں لیا ——— یہ چیزیں تو پھر بھی کام آجائیں گی ——— تم ہمارے کس کام کی ——— "ٹھیک ہے انسانیت کس کام کی ہے ——— ؟ مفلوج اور کوڑھی انسانیت جسے امرتسر میں لنگڑا کر کے رکھ دیا گیا ——— چیخیں اور زیادہ نزدیک ہو گئیں کئی چیخوں کو ہم پہچان سکتے تھے۔ "یہ محمد حسین کی چیخ بلند ہوئی ہے یہ اس کی ماں کی ——— یہ اس کے ننھے امجد کی اور اس کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ہم نے بھاگتے ہوئے خیال کیا۔ ہندو ہمسائیاں اپنے خاوندوں کو بلند آواز سے گالیاں دے رہی تھیں "موئے بزدل"، "تبھی تو مار کھاتے رہے۔ گھر میں چوہا آنا بُرا لگتا ہے ——— !"

رات کی تاریکی میں گھسٹے گھسٹاتے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ بلوچ رجمنٹ نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ سیتلا مندر اور شمشان بھومی تک جاتی ہوئی بلوچوں کی گولیوں نے سٹیشن پر بیٹھی ہوئی مخلوق کے حوصلے بڑھا دیئے۔ اور انہوں نے اپنی طمانیت کا اظہار کر ہی دیا ——— ایک ریل سے ہندو کو جو خدا جانے سٹیشن پر کیسے آگیا تھا میرے بھائی نے ختم کر کے اپنی دانست میں اپنی بیوی کا انتقام لے لیا۔

میں پل پر چڑھ کر امرتسر کو دیکھنے لگا۔ جہاں سے کبھی سکول سے بھاگ کر گاڑیوں کو آتی جاتی دیکھا کرتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے تمہیں اپنے بچپن کے کارنامے سناتے ہوئے بتایا تھا۔ کہ یہ جگہ شہر بھر کے کھلنڈرے اور آوارہ بچوں کا مسکن تھی ——— اور شاید منٹو کو "کالی شلوار" کی بہترین تشبیہہ بھی یہیں سے سوجھی ہو۔ (وہ بھی تو ہماری طرح آوارہ سا تھا) ——— اب اس پل پر سے میں جلتے سلگتے امرتسر کو دیکھ رہا تھا۔ ایک کونے کے شعلے دوسرے کونوں کے شعلوں سے وصل کے لئے بے قرار تھے۔ اور ہم کنار ہو کر ان کی تمازت اور شدت میں اضافہ ہونے لگا ——— سٹیشن کو بھاگ کر آتے ہوئے لوگ ——— سہمے ہوئے بچے، ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے بچے، میں ان کے چہروں کی زردی میں انسانیت کی مایوسی دیکھ رہا تھا ——— "یہ کیا ہے ——— یہ سب کیا ہے" میں چیخ اٹھا "میں ایسا نہیں برداشت کر سکتا ——— یہ

پردہ میری نظروں سے ہٹادو۔ ایسی ایسی بھیانک تصویریں دیکھنے کا عادی نہیں ہوں —— میں جیتی جاگتی زندگی کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ موت کی خاموشی اور بچ نکلنے کی خوشی کی میرے نزدیک کوئی قیمت نہیں، میں زندگی چاہتا ہوں —— رواں دواں —— مجھے موت پسند نہیں، میں جینا چاہتا ہوں —— مجھے آبِ حیات پلا دو۔ میرے گلے میں خشک پتے کی طرح چرچراتی زبان پر دو قطرے آبِ حیات ٹپکا دو —— زندگی زندگی —— ! میں اسی پل پر گر پڑا —— ایک بلوچ اوپر آیا اور مجھے کہنے لگا "اب ہمارا جھتا نیچے تک ہے —— اوپر نا ہیں —— نیچے آئیے، اوپر خطرہ ہے ——!" اور انسانیت محدود ہو گئی ایک پلیٹ فارم پر —— جہاں بین کرتی ہوئی عورتیں —— دھرتی کی بہو اور بیٹیاں، چھاتیاں کوٹ رہی تھیں —— ہائے سکھوا خدا انہیں غارت کرے —— ! تم ہماری رتو کو لے گئے —— !! کتنی حسرت تھی —— !

حواس باختہ میاں نے بیوی کے کہنی لگائی "اب چپ بھی رہو —— کیا خبر ہے جو کہیں سے مل ہی جائے —— !"

لوگ ایک دوسرے سے پوچھ کر اپنے دلوں کو تسلیاں دے رہے تھے "سناؤ میاں ! تم کیا چھوڑ آئے —— ؟"

"جانیں تو سلامت رہیں —— !" "ہاں بھئی یہی غنیمت ہے —— !"

اور گاڑی کی صعوبتیں سہتے ہوئے ہم لاہور پہنچ گئے۔

مسلح جوان شاہ عالمی اور لوہاری کو "صاف کرنے" کی غرض سے نکلے اور ہندو بھی ہو گئے۔ ساگر اب بھی پاکستان میں تھا۔ تم دو صیاد ہی تھے اور نا معلوم کتنے ہندو اور سکھ اور تھے —— اور مسلمانوں کا خون کھولتا رہا —— امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور، کپورتھلہ —— اور پاکستان۔ عمل اور ردِ عمل کا شیطانی چکر چلتا رہا —— بیگم روڈ پر مزنگ والوں نے دھاوا بول دیا۔

ساگر بھی لاہور سے بھاگ نکلا۔ اس کی بہن مسلمان مجاہدین کے قبضے میں آ گئی —— قومی ملکیت کا اشتراکی نظریہ پوری شدت سے عمل پذیر رہا اور۔ . . . ساگر کی خوبصورت بہن مزنگ والوں کے لئے باعثِ نزاع بن گئی —— انفرادی سرمایہ داری کی لعنت —— ! کئی نوجوان کانتا کو مارنے کے درپے ہو گئے۔ مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حضور دلال نے بڑے بوڑھوں کی نصیحت سے فائدہ اٹھا لیا۔ اور کانتا کو اٹھانے والوں کو بھی مزدوشیانہ مل گئی —— آج کانتا ایک حُسن خانہ کی زینت ہے —— کبھی لاہور آئے تو دیکھنا —— ! میں نے تو پوچھا بھی نہیں کیسی ہو —— ؟ مگر تم لاہور کیوں آنے لگے ——

میں دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔ سنتا رہا اور گریہ لب ہو کر رہ گیا "پاکستان اور ہندوستان —— تقسیمِ پنجاب —— تقسیمِ بنگال —— انڈو پاکستان اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے —— کشمیر کا معاملہ بھی خوب ہے —— والا مند ساگر، کرشن چندر اور ملک راج آنند کشمیر پر بہت لکھتے تھے۔ کشمیر کی بد انتظامی کو کوستے تھے، ریاستی افسروں کی بیگار کی مذمت کرتے تھے۔ عوام کی پس ماندگی کا رونا روتے تھے۔ مگر آج جب اپنا دوست یا تو وطنی اور شخصی آزادی کے لئے اٹھے ہیں۔ تو یہ سب کماؤ ادیب چپ کیوں ہیں ؟ جواہر لال اور سپرو —— کشمیر کی حسین وادی کے دو بیٹے —— آج کیوں عوام کا ساتھ نہیں دیتے"۔ یہ ہیں پاکستان کے سیاست دان ادیبوں کے خیالات جن کے جاننے کی تمہیں بہت خواہش ہے ——

ہاں اور تم نے کیا لکھا —— ! مظفر ! تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے —— "کس سے ؟ مجھ سے ؟ جو کبھی تمہارا

ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ جس کے قہقہے جس کی مسکراہٹیں جس کی حسین یادیں تم سے وابستہ ہیں۔ حسین یادیں جو میرے شعور پر پھر سے اُبھر آتی ہیں اور میں بکھری بکھری یادوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ دل خوش کن مناظر جو کشمیر کے دیہات میں ہم نے دیکھے آج بھی میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں ——— تین ماہ کا مختصر قرب ——— میرا اور تمہارا کشمیر میں ملنا جو محض ایک حادثہ تھا۔ تم ایک بچے تھے اور اپنے سردار جی کے ساتھ آئے تھے۔ میں اور بھیا بھابی کو دق کے جراثیم سے نجات دلانے کے لئے کشمیر کی خوشگوار فضا میں لائے تھے۔ تم جلو کے قریب رہتے تھے اور لاہور میں پڑھتے تھے۔ میں امرتسر میں تھا۔ بھیا اور تمہارے سردار جی خشک سے مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر کے آدمی تھے۔ تم اور میں ابھی بچے تھے، اور ہمارا گٹھ جوڑ ——— سیاست اور مذہب کی حدود سے بہت پرے کے خیالات پر منحصر تھا تمہارے پاس ایک فانٹا تھا اور میرے پاس کوڈک ——— شاید یہی فرق تھا جو مجھ میں اور تم میں تھا ——— تم بچے تھے اور میں بھی بچہ تھا ——— ایک ہی درجے کے طالب علم، امنگیں ایک تھیں، ارادے ایک سے تھے۔ خیالات ایک تھے، جذبات طفلانہ تھے اور بدستور ہیں ——— اور کشمیر میں تین ماہ ہم نے ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے، تیتریاں اور پھولوں کی نازک پتیاں جمع کرنے میں گذار دے ——— اور میں امرتسر میں آٹھویں درجے کو مشکل مکمل کر سکا اور والدین کو مجبور کر دیا کہ مجھے تمہارے ساتھ لاہور میں رہنے دیں۔

دو سال ہم نے لاہور میں گذار دیئے ——— یک جان دو قالب کی ضرب المثل اگر غلط نہیں تو بے محل ضرور ہے کیونکہ یہ ہماری صحیح مصداق نہیں ——— یک جان و یک قالب ——— ! ہاں یہی درست ہے ——— ! ! ہمارا بچپن مختلف ماحول میں گذرا۔ اس لئے ہماری خوراک میں دودھ اور چائے کا فرق باقی رہا ——— اسی زمانے میں ہم پر شاید ہلکا ہلکا مذہبی رنگ چڑھ گیا۔ مگر تمہیں احساس ہوگا۔ کہ ہم نے مذہبی جذبات کو کبھی اپنی انسانیت پر غالب نہیں آنے دیا۔ جب ہم دسویں درجے میں آئے تو تم نے جپ جی کا پاٹ شروع کر دیا ——— ہم ساتھ ساتھ تو تھے ہی ——— میں نے تم سے ہنسی میں کہدیا: یونیورسٹی کا امتحان نزدیک آرہا ہے ——— جیجی! تم نے جپ جی کا پاٹھ شروع کر دیا ہے کیوں ٹھیک ہے نا؟ اور مجھے یاد ہے تم نے اپنی کھڑکی دار پگڑی کو درست کرتے ہوئے کہا تھا: ممکن ہے ایسا ہی ہو ویسے میں دُعا کا قائل نہیں۔ تم بھی تو قرآن پڑھ لیا کرو کیا ہرج ہے؟ اور میں نے قرآن کو سریع التاثیر سمجھ کر تلاوت شروع کی۔ تمہیں بھی یاد ہوگا۔ جب میں نے تمہیں گرنتھ صاحب کا کچھ حصہ سنانے کے لئے کہا اور تم نے مجھے جو کچھ سنایا وہ مجھے قرآن کی پہلی سورۃ کا آزاد ترجمہ معلوم ہوا۔ اور تم نے مجھ سے یہ بھی کہ گرنتھ صاحب میں بابا فرید کے لکھے ہوئے اشلوک بھی شامل ہیں ——— اور اب ——— ! میں سوچتا ہوں یہی دو کتابیں ہیں۔ جن کے تحفظ و ناموس کا نام لے کر جن کے متبادل پیغامات بتلا بتلا کر انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا گیا ——— یہ مذہبی آدمی بھی کیا کام کی چیزیں بن بیٹھے ہیں ——— موم کی ناک کو جدھر چاہا گھما دیا ——— !

آجکل رنجیت سنگھ کی سمادھ قائم ہے۔ مگر وہاں جوڑ میلہ نہیں لگتا ——— وہاں کوئی گوردیپ نہیں جس کے ساتھ جا کر میں مسلمان میراثیوں اور ربابیوں کے منہ سے گرنتھ صاحب کی کتھا سنوں۔ اس لئے کہ مسلمان میراثی اور ربابی جن کا کام ہی گوردواروں میں کتھائیں گانا تھا اب کہاں جائیں ——— ! سمادھ میں کوئی سکھ نہیں ہے ——— پارک میں کوئی میلہ نہیں لگتا ——— اور ہو بھی تو وہ صرف مسلمانوں کا ہوگا ——— انسانوں کا نہیں ——— رنجیت سنگھ کی سمادھ ویران ہے۔ اور بادشاہی مسجد میں مسلمان موجود ہیں ——— اس بادشاہی مسجد میں جہاں . . . .

جہاں میں تمہیں ایک بار۔ ایک جلیل القدر علامہ کا وعظ سنانے لے گیا تھا۔ اور واپسی پر جب تم نے مولوی کے کف آور وعظ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا "مولوی جی نے فرمایا ہے۔ مشرک نجس ہوتے ہیں۔ ان سے لین دین بند کردو۔ ان سے ملو نہیں۔ خواہ وہ تمہارے کتنے بڑے دوست کیوں نہ ہوں! اور مومن آپس میں رحمدل ہوتے ہیں اور کافروں کے جانی دشمن ....." اور تم نے "تمہارا کیا خیال ہے" کی سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں نے کہا "یہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے بیچارا، مشرکوں سے بچو! تم کہاں مشرک ہو۔ — سکھ تو توحید پرست ہوتے ہیں"

اور پھر سکول کے بعد — تین چار مہینے بڑے کٹھن دن — امیدِ موہوم کے انتظار میں گذار دیئے۔ تمہیں تو اپنے بہترین ایتھلیٹ (ATHLETE) ہونے کا انعام مل چکا تھا مگر میں تو ....

آخر خوشگوار نتیجے کے بعد میں کالج میں آ گیا اور تم گاؤں میں بیمار پڑے رہے۔ میرے سکالرشپ نے مجھے ہوسٹل میں کیوبیکل دلوا دیا۔ تم بہت دیر سے پہنچے اور تمہیں ہوسٹل میں کوئی جگہ نہ ملی — میں نے اپنے کیوبیکل میں اپنے دل کی وسعت پیدا کی۔ نسیم اور دوسرے لڑکے حیرت زدہ سے ہو گئے — "ہیں! ایک سکھ کو اپنے کمرے میں رکھ لیا — خدا ایسے کافروں سے سمجھے — توبہ ہے توبہ!"

ہوسٹل کے کمروں کی ملحقہ دیواروں کے اوپر لوہے کی فینس تھی جسے تم کبوتر خانہ کہا کرتے تھے اور جس کی بدولت چھ سات کمرے پرے کی آواز آسانی سے سنائی دے سکتی تھی۔ کئی بار نسیم اور مقبول کو تم نے میرے بارے میں باتیں کرتے سنا اور کئی بار ساگر اور کہر سنگھ کی سرگوشیاں میرے کانوں تک پہنچ گئیں۔ نسیم سکول میں مجھ سے پیچھے رہ گیا۔ مجھے طلائی تمغہ ملا۔ اور اسے دو کتابیں۔ نتیجہ خدا واسطے کا بیر۔ اور کہر سنگھ کو تم اچھی طرح سے جانتے ہو — دھوتی دھکیل قسم کا فضول سا، جڈ گنوار جسے بات کرنے کی تمیز نہیں تھی۔ اور تمہارے جسم کی پھرتی اور لچک سے جسے حسد تھا کہ تم ATHLETIC CHAMPIONSHIP جیتنے میں ناکام رہا اور اب تم سے ہمدردی جتا رہا تھا۔ کمینہ کہیں کا!

تمہیں شاید یاد ہو۔ ایک بار میں کمرے میں آیا۔ تم اندر نہیں تھے۔ کہر سنگھ کے کمرے سے تمہاری، کہر سنگھ کی اور تمہارے سردار جی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کبوتر خانے پر کان لگا دیئے۔ سردار جی کہہ رہے تھے "تو تمہارا ساتھی ابھی تک نہیں آیا" تم نے کہا "نہیں! آیا تھا۔ ابھی باہر گیا ہے"۔ سردار جی نے اپنی آواز میں بزرگی کا تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا "گردیپ! تم میری بات نہیں مانو گے۔ مگر یاد رکھو — آج کے دوست آج کے عزیز — آج کی دنیا نہایت رذیل ہے۔ تم ابھی تک اس کے ساتھ رہتے ہو۔ اب کے میری ضلع میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ مجھے بھی آسانی رہے گی۔ چلو میرے ساتھ ٹمپل روڈ پر" اور تم نے انکار کر دیا "فسادات شروع ہو چکے ہیں۔ کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ گرداں جانے تمہیں کسی وقت زہر ہی نہ دے دے تو —" اور تم نے ایک بھرپور قہقہہ لگا دیا "بدتمیز تو تھے ہی —!" اور تمہارے سردار جی نے کہا "اب تو ہنستے ہو، پتہ چلے گا جب کچھ ہو جائے گا — گردیپ! میری مانو! حماقت نہ کرو۔ مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا" اور آج بھی جب اخبار پڑھ کر لوگ موجودہ واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی شدید ترین فیصلہ کا اظہار کرتے ہیں "کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا" تو معاً مجھے تمہارے سردار جی یاد آ جاتے ہیں۔

اور بھی تمہیں کچھ یاد آتا ہے — ؟ نسیم کی کوئی بات؟ کہر سنگھ کا نعرہ "راج کرے گا خالصہ ......"؟

نہیں کیا — !!

تمہیں معلوم ہے "سلام علیکم" سے مخاطب کرنے کی بجائے "وعلیکم السلام" کہنا میری عادت تھی۔ ایک راسخ الاعتقاد مسلمان کے نزدیک اسے مذہب سے مذاق تصور کیا جاتا ہے۔ ایک بار تم اور نسیم بیٹھے ہوئے کیمسٹری دیکھ رہے تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "نسیم اور سردار جی! وعلیکم السلام" اور نسیم نے اپنی ساری تلخی ناک اور ماتھے کی سلوٹوں اور جھریوں میں سمیٹ لی۔ تمہیں معلوم ہے کیوں؟ اس نے بعد میں مجھ سے کہا "ایک تو تم نے اسلام کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔ اور پھر سکھوں کو بھی سلام کرتے ہو۔"

"تو پھر انہیں کیسے بلایا جائے" میں نے استفسار کیا۔ اس نے شستہ سا جملہ بتایا جو آج بھی وقت بے وقت میرے ذہن میں آیا ہے۔

"والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ"

"یعنی؟"

"سلام ان پر جو ہدایت یافتہ ہیں"

"سلام ان پر جو تعلیم یافتہ ہیں"

"یعنی سلام ان پر جو تعلیم یافتہ ہیں" میں نے اس کے عقائد کا مذاق اڑا دیا اور وہ تیوریاں سمیٹتا بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔

اور پھر میرے ابا جان۔ بھیا اور نہ جانے کون کون آئے اور مجھ سے کہا "یہ سکھ ہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تم کسی نہ کسی طرح اسے نکال باہر کرو۔ معلوم نہیں کس وقت۔۔۔۔۔"

"مجھے کیا؟" میں نے ان کی بات کاٹ لی۔

"تمہیں نقصان نہ پہنچ جائے بیٹھے بٹھائے ——" "ہاں ہاں! آج کل زمانہ بھی کیسا ہے۔ اسے مذاق نہ سمجھو" بھیا نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اور میں کمرے میں آ کر بستر پر گر پڑا اور سوچنے لگا کیا واقعی ہم اتنے ذلیل ہو سکتے ہیں۔

تم آئے تو میں نے تمہاری کرپان اتار لی اور اپنے سکالرشپ کے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس کی پن تمہاری کرپان کی کند نوک سے کھولنے لگا۔

اور پھر جب ہوسٹل میں حملے کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ کبھی لڑکوں کا تخلیقی ذہن بھائی دروازے کی طرف سے کسی حملے کا تخیلی ڈھانچہ تعمیر کر لیتا اور کبھی پیسہ اخبار کی طرف سے اور بقول نسیم کے آہستہ آہستہ اس خدشے نے ہوسٹل میں خالصہ راج کو ختم کر دیا۔ تم سردار جی کے ساتھ مِیل روڈ پر چلے گئے اور ساگر بیگم روڈ پر جہاں اس کی ماں اور بہن گجرات سے بھاگ کر آئی تھیں۔

جاتے وقت تم مسلم ریلیف کیمپ میں دے آنے کے لئے مجھے کچھ کپڑے دے گئے اور کہا "اگر مجھے زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوتی تو میں خود دے آنے کی کوشش کرتا" وہ کپڑے، تو قومی محافظوں کے سالار اعلیٰ نے اڑا بھی لئے ہوں گے —— ذرا اچھے تھے ——!

آج کل یہاں ہر طرف "شیر مادر" کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہیں وہ شیر مادر جو پولیس اور مجاہدین کی وساطت سے لوگوں تک آیا ہے اور خوب کاروبار ہو رہے ہیں۔ تم شاید سن کر خوش ہو گے کہ کالج ٹائم کے بعد میں بھی کاروبار کرتا ہوں۔ ایک

نفع آور تجارت، کتابوں کی تجارت ——— ٹیگور، شیکسپیئر، دانتے، ارسطو، گورکی، چیخوف اور بیسیوں ایسے ادیب چار روپے من خریدتا ہوں اور خوب کماتا ہوں۔ اس لئے کہ ان کتابوں کی افادیت اور فروخت کو مجھ سے بہتر کوئی کباڑیا نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ٹیگور اور گورکی کو امرتسر سے اٹھا لایا۔ یہ تو چار روپے من مجھے یہاں بھی مل سکتے تھے ——— !!

اور نسیم!

اس نے مجھے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مجھے اشتراکی، بے دین اور مرتد عن الاسلام کہہ کہہ کر اس نے مجھے میرے وسیع ماحول میں رسوا کر دیا۔ اور ایک دن میرے بہت سے رشتہ داروں، دوستوں، عزیزوں کو جمع کر کے مجھے خوب جلی کٹی سنائیں۔ میرے ان دوستوں نے جن پر مجھے فخر تھا۔ مجھ پر آزادانہ لعن طعن کی۔ ایک مولوی نے جو میرے عزیز ہوتے ہیں کہا کہ لعنت اللہ علی الکافرین اس جیسے لوگوں کے لئے نازل ہوا تھا۔ میں نے بھی بہت کچھ کہا سنا۔

کاش کہ میں تمہارے بھائی کی طرح گونگا بہرا ہوتا!

تم نے لکھا ہے۔ ستیارتھی کہتا ہے جنگ نے عوام کو تمام تہذیبی سوتوں سے پرے پھینک دیا ہے اور عورتیں لوک گیتوں کی بجائے اب ایسے گیت گاتی ہیں:- اگے راہی راہ پچھدے ہن پچھدے نے لڑائی کتھے لگی۔ ان فسادات نے بھی تہذیبی سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اور ایک بوند بھی باقی نہیں چھوڑی۔ عوام کے دل نفرت سے بھر چکے ہیں۔ ان میں آشتی کی جگہ انتقام کا جذبہ ہے اور لوک گیتوں نے خودکشی کر لی ہے۔ اس لئے کہ اب ان کے لئے کوئی پاکیزہ سینہ نہیں! تمام آوازیں گندی ہو چکی ہیں۔ اب سینوں میں تنفر نے ڈیرا جمایا ہے اور لوک گیتوں نے ماسٹر تارا سنگھ دے نوحہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ــــ

آ اک واری مزا چکھائیے ——— تینوں دس پٹھان دی پاییئے
مُغل جاون چترائیاں ——— دسے ماں دیا تاراسیاں

تاراسیاں
توں کیوں پٹھیاں پائیاں
دسے ماں دیا تاراسیاں

کیوں کچھ مزا آیا ——— یہ ایسا مزا تو شاہ حسین اور کبیر کے دوہوں میں بھی نہیں۔ ڈاکٹر فرزانہ سے کہئے۔ اس گیت کو آئندہ انتھالوجی آف پنجابی لٹریچر میں شامل کریں بہرحال میں تمہیں پورا گیت بھیجوں گا۔

نسیم کی کمینگی ——— ! اب کیا یاد آئے گی ——— !

کیونکہ میں رسوائی سے دور بھاگ رہا ہوں ——— !

اس کمینے ساگر کی نصیحت پر عمل کرنا بہتر ہوگا یا نہیں ——— !

سوچتا ہوں مجھے ایران جانا ہی پڑے گا —— : جلد یا بدیر ——— !

تمہیں کچھ کہوں کیا کروں۔

تمہارا
مظفر

قتیل شفائی

لُڑھکتا پتھر

روشنی ڈوب گئی چاند نے منہ ڈھانپ لیا
اب کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی مجھ کو
میرے احساس میں کہرام مچا ہے — لیکن
کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی مجھ کو

رات کے ہاتھ نے کرنوں کا گلا گھونٹ دیا
جیسے ہو جائے زمیں بوس شوالا کوئی
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، یہ گھنا سنّاٹا!
اب کوئی گیت ہے باقی نہ اجالا کوئی

جس نے چھپ چھپ کے جلایا مری اُمید کو
وہ سلگتی ہوئی ٹھنڈک مرے گھر تک پہنچی
دیکھتے دیکھتے سیلاب ہوس پھیل گیا
موجِ پایاب اُبھر کر مرے سر تک پہنچی

مرے تاریک گھروندے کو اُداسی دیکھ
مسکراتے ہیں جھروکوں میں اشارے کیا کیا
اَب یہ اُمید کا مدفن یہ محبت کا مزار
اس میں دیکھے ہیں تباہی کے نظارے کیا کیا

جس نے آنکھوں میں ستارے سے کبھی گھولے تھے
آج احساس پہ کاجل سا بکھیرا اُس نے
جس نے خود آ کے ٹٹولا تھا مرے سینے کو
لے لیا غیر کے پہلو میں بسیرا اُس نے

وہ تلوّن کہ نہیں جس کا ٹھکانہ کوئی
اُس کے اندازِ کہن آج نئے طور کے ہیں
وہی بیباک اشارے وہی بھٹکے ہوئے گیت
کل مرے ہاتھ بکے آج کسی اور کے ہیں

یہ مہکتا سا، چہکتا سا، اُبلتا سینہ
اس کی میعاد ہے دو روز لپٹنے کے لئے
زلف بکھری ہوئی بکھری تو نہیں رہ سکتی
پھیلتا ہے کوئی سایہ تو سمٹنے کے لئے

اختر ہوشیارپوری

نوروز

اب کے گلشن میں بہ طرزِ نو بہار آئی تو کیا کھل سکے غنچے نہ کلیوں پر جوانی آ سکی
زرد پتوں کی وہی رنگت وہی افسردگی اتفاقاً بھی سرور آیا نہ مستی چھا سکی
سوچتا ہوں وہ نویدِ بےخودی کیا ہو گئی؟

بڑھ کے گل کر دے گلستاں کا چراغِ رنگ و بو پھول آخر پھول ہیں لب بھی ہلا سکتے نہیں
نیم وا غنچوں کی آنکھوں میں یہ شبنم کی نمی صرف رو سکتے ہیں لیکن مسکرا سکتے نہیں
یا الٰہی وہ نویدِ سرخوشی کیا ہو گئی؟

لوگ کہتے ہیں ترے بس میں ہے تنظیمِ بہار یہ شجر یہ پتیاں، یہ گل، یہ سبزہ یہ نسیم
کب تک آخر اعتبارِ زندگی بن کر رہیں یہ رسومِ عہدِ ماضی یہ روایاتِ قدیم
مدتوں کی وہ نویدِ روشنی کیا ہو گئی؟

جنید کوثر

یہ جھوٹ ۔ یہ افترا

"ہر ادب پراپیگنڈا ہے" یہ بحث پرانی ہو چکی اور طے بھی ہو چکی کہ ہر ادیب خواہ وہ کمیونسٹ ہو یا نہ ہو، ترقی میں اعتقاد رکھتا ہو یا رجعیت کا دلدادہ ہو وہ پراپیگنڈا کرتا ہے۔ جس وقت گیلیلیو نے کہا تھا کہ زمین گول ہے۔ تو اس نے بھی پراپیگنڈا ہی کیا تھا، ہر حقیقت کا اظہار پراپیگنڈا ہے۔ جس وقت کوئی بیان حقیقت کو جھٹلا رہا ہے، تو وہ پراپیگنڈا ہی نہیں رہتا بلکہ جھوٹ کہلاتا ہے۔ مگر آج یہ میری اور آپ کی بدقسمتی ہے کہ جھوٹ اور پراپیگنڈا ایک ہی معنی میں استعمال ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مثلاً آنجہانی سے لے کر محکمہ تعلقات عامہ مغربی پنجاب تک سبھی پراپیگنڈے کے نام پر جھوٹ بولتے رہے ہیں اور آج بھی بول رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جھوٹ اور پراپیگنڈے میں امتیاز کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ جھوٹ بولنے والے گروہ کے پاس ذرائع کی اس قدر افراط ہے کہ وہ اپنے جھوٹ کو سچ کے روپ میں پیش کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسی کامیابی پر ان کی زندگی کا دارومدار رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب بھی ادب زندگی کی حقیقتوں اور ان کی تلخیوں کی کما حقہ ترجمانی نہیں کرتا وہ پراپیگنڈے کی حدود سے نکل کر جھوٹ کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور میرے نزدیک یہ ادب صرف رجعت پسندی نہیں بلکہ سرے سے ادب ہی نہیں۔ کیونکہ جو ادب سچائی اور حقیقت کے اظہار سے کتراتا ہے وہ کیسے ادب کہلا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حکمران طبقے آج تک اپنے مفاد کی خاطر یا تو حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے ہیں یا پھر مسخ کرتے رہے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ پانچ فیصدی انسانوں کا حکمران طبقہ ۹۵ فیصدی انسانوں پر اپنا تحکم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو مفلس، جاہل اور غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ پانچ فیصدی کو حقیقت سے آگاہ نہ ہونے دیں انہیں غلط اطلاعات بہم پہنچائیں ان کی توجہ اصل مسائل سے ہٹائے رکھیں تاکہ یہ ۹۵ فیصدی انسان اپنے پانچ فیصدی آقاؤں کے اصل روپ اور چلن سے آشنا نہ ہو جائیں۔ اس لئے یہ ضروری ٹھیرا کہ پریس کو خرید لیا جائے۔ اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹا جائے اور نوا اور خودستا ادب پیدا کیا جائے۔ اس لئے نہیں کہ حکومت ہمارے کلچر کو جلا دینا چاہتی ہے اور عوام کے ادبی ذوق کی تشفی کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ وہ ایک طرف ادیبوں کو جھوٹا ادب پیش کرنے کی ترغیب دینا چاہتی ہے اور دوسری طرف وہ عوام کو ان ادیبوں کے نام سے دھوکے دینا چاہتی ہے۔ اور ان کو خیالی دنیا کی بھول بھلیوں میں کھو دینا چاہتی ہے۔

پاکستان کی مرکزی حکومت کا ماہوار ادبی رسالہ "ماہ نو" حکومت مغربی پنجاب کے محکمہ تعلقات عامہ کا منتر اور اخبار "استقلال" اور "مہاجرین" وغیرہ سرکاری تعلیمی رسالہ "آموزش" یہ سبھی حکمران طبقے کے　　مفاد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں ان سرکاری نیم سرکاری رسالوں کے مضامین کی غلط بیانیوں اور جھوٹ کی نئی ٹیکنیک پر اظہارِ رائے کرنے سے پہلے اس شعبے پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس سے عموماً لکھنے والے آگاہ ہونے سے کتراتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد محنت کشوں اور درمیانے طبقے کے لوگوں نے بڑھتی ہوئی گرانی کے خلاف اخباروں میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس مطالبے میں ریلوے کے مزدور، ڈاکخانے کے ڈاکئے، صوبائی حکومتوں کے کلرک مرکزی حکومت کے ۴ لاکھ ملازمین سبھی شامل تھے۔ انہوں نے منت کی تھی۔ سماجت کی تھی، ہاتھ باندھے تھے کہ حضور ہمارا تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہئے۔

مگر اس کا جواب اپنی حکومت نے یہ دیا کہ تم پاکستان کے دشمن ہو۔ کمیونسٹ ہو، ففتھ کالم ہو۔ پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ تم جانتے نہیں کہ پاکستان ابھی ابھی وجود میں آیا ہے۔ ہمارے پاس روپیہ نہیں۔ اور تم اس کا تقاضا کرتے ہو اور اس کے بعد غلط بیانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا سینما میں سلائیڈیں دکھائی جانے لگیں۔ اشتہار چھپنے لگے۔ ریڈیو سے شوکت تھانوی اور رسالوں سے حسن عسکری مزدوروں اور ہڑتالوں کے خلاف بولنے اور لکھنے لگے۔ لوگوں کو پاکستان کی مالی زبوں حالی کی دہائی دے کر ہڑتال سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی، مگر آج حکومت جن اداروں پر روپیہ خرچ کر رہی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکومت ایک ایسے طبقے کی حکومت ہے جو اپنی زندگی اور اپنے مفادِ خصوصی کی حفاظت کے لئے تو روپیہ صرف کر سکتی ہے۔ لیکن عوام کی ضروریات کے لئے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ چنانچہ "استقلال" کے بارے میں حکومت پنجاب نے جو رقم منظور کی ہے۔ اس کی تفاصیل حسبِ ذیل ہیں:۔

استقلال

عملہ

عہدہ	تعداد		تنخواہ بمعہ الاؤنس
ایڈیٹر	۱		۴۲۵ روپے
اسسٹنٹ ایڈیٹر	۲	فی کس ۲۶۰ روپے	۵۲۰ "
منیجر	۱		۲۲۰ "
پروف ریڈر	۱		۱۳۵ "
اکاؤنٹنٹ	۱		۱۲۰ "
محرر	۱		۷۵ "
دسٹوار	۱		۶۵ "
دفتری	۱		۴۵ "
چپراسی	۴	فی کس ۴۰ روپے	۱۶۰ "

اس کے علاوہ امدادی سٹاف بھی ہے جو براہِ راست استقلال کے ادارے میں شامل ہیں لیکن در اصل ان کا کام استقلال کے لئے لکھنا اور مواد مہیا کرنا ہے۔

عہدہ	تعداد		تنخواہ بمعہ الاؤنس
ریسرچ افسر	۱		۴۲۵ روپے
کیمرہ مین	۲	فی کس ۳۰۰ روپے	۶۰۰ "
آرٹسٹ	۱		۴۲۵ "

اس کی اشاعت، کاغذ اور چھپائی وغیرہ کا سال بھر کا خرچ جو حکومت نے منظور کیا ہے وہ ۹۵ ہزار ہے اور اس طرح سے سال بھر کا کل خرچ تقریباً ایک لاکھ چونتیس ہزار پانچسو چالیس روپیہ ہے ۔ اس میں ابھی وہ رقم شامل نہیں جو لکھنے والوں کو خریدنے کے لئے ہدیئے کے نام پر دیجاتی ہے۔ یہ تقریباً دس روپیہ فی کالم ہے اور ابھی تک استقلال کے جو شمارے دیکھنے میں آئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم نصف پرچہ غیر ملازم ادیبوں کی تحریروں سے پر ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ ز کم بیس ہزار روپے سالانہ کا مزید خرچ استقلال کو برداشت کرنا پڑتا ہے ۔

اور اگر پورے تعلقات عامہ کا سالانہ خرچ دیکھا جائے تو وہ ۹ لاکھ سے کچھ اوپر ہے ۔ ملازمین کی اجرتوں میں اضافے کے لئے روپیہ نہیں لیکن جھوٹ کی نشر و اشاعت کے لئے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے ۔ تاکہ ایک عوام دشمن گروہ عوام کے روپے سے ہی اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے ۔

اس وقت ہر اس باحس ادیب کو جسے اپنے لوگوں سے پیار ہے ۔ جسے انسانی عظمت پر یقین ہے ۔ اور جو انسان کے درخشاں مستقبل کے سہانے سپنوں کی تعبیروں کی تلاش کرتا ہے ۔ حالات کا سختی سے جائزہ لینا ہوگا ورنہ اس کا ادب ایک عوام دشمن گروہ کا سرکاری ادب بن کر رہ جائے گا ۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ لکھنے والے اس حکمران طبقے کے عوام دشمن رجحانات سے نہ صرف واقف ہی ہوں بلکہ اس پورے فلسفے کو بے نقاب کریں اور ان کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کریں ۔ آج وقت کا یہی تقاضا ہے اور ادب کی خدمت اور اس کی بھی ایک راہ ہے ۔

استقلال کے پہلے شمارے میں طفیل احمد خان کا مضمون مغربی پنجاب کی زرعی پیداوار ہے ۔ اس مضمون میں جو اعداد و شمار دئیے ہیں وہ واقعی قابل داد ہیں ۔ اور اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم تھوڑی بہت اطلاعات میں تو اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ یہ ہمارے حکمران ایسے مضامین لوگوں کی اطلاعات میں اضافہ کے لئے شائع کرتے ہیں بلکہ ایسے مضامین اور ان کے اعداد و شمار سے وہ حقیقت کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی آسانیاں حاصل کرتے ہیں اور اس طرح سے اپنے فلسفے کو تقویت پہنچاتے ہیں ۔

اس مضمون میں طفیل احمد صاحب لکھتے ہیں :۔

> اناج کے لحاظ سے پاکستان کا یہ زرخیز، خوبصورت اور شاداب قطعہ جسے ہم مغربی پنجاب کہتے ہیں خود کفیل ہے ۔ فالتو غلہ یہاں سے دوسرے صوبوں اور ملکوں میں بھی بھیجا جاتا ہے

چنانچہ طفیل صاحب اعداد و شمار دیتے ہیں ۔

> گیہوں کے لحاظ سے مغربی پنجاب کی پیداوار ۶ کروڑ ۴۸ لاکھ من ہے اور سالانہ خرچ تقریباً ۵ کروڑ ۲۶ لاکھ من ہے ۔ گویا کوئی ایک کروڑ ۲۲ لاکھ من گیہوں ہمارے ہاں فالتو ہوتا ہے

اب ان اقتباسات سے جو میں نے اوپر دیئے ہیں حقیقت کا پورا چہرہ روشن نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف ایک رُخ ہی نمایاں ہوتا ہے۔ اور سرمایہ دار طبقے نے جھوٹ کا یہ بھی ایک طریقہ ایجاد کیا ہے یعنی کہ ادھوری حقیقت بیان کر دی جائے اور اس سے اپنے مطلب کے نتائج اخذ کر لیئے جائیں۔ چنانچہ طفیل احمد صاحب نے جو لکھا ہے وہ بھی ادھوری حقیقت ہے۔ پوری حقیقت یہ ہے کہ ایک کروڑ ۲۲ لاکھ من فالتو گیہوں پیدا کرنے والے صوبے میں لوگوں کو گیہوں میسر نہیں۔ ان کو راشن کے ساتھ جو مل رہے ہیں؛ دیہات میں بہم اور پچاس روپے من پر گندم بک رہی ہے؛ اور چاولوں کا بھی یہی حال ہے۔ طفیل صاحب کو پوری حقیقت کی فراہمی میں زیادہ تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ اپنی کسی عزیزہ سے جسے چولھا جھونکنا پڑتا ہے اور راشن منگوانا پڑتا ہے پوری حقیقت کا پتہ کر سکتے تھے۔

اس پر بعض ادیب ناک منہ چڑھائیں اور کہیں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ہی مضمون میں سبھی حقائق پر روشنی ڈالی جائے۔ میرے نزدیک یہ ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ایک مسئلے کے تمام خد و خال نمایاں نہیں ہوتے اس وقت تک پوری حقیقت اجاگر نہیں ہوتی اور اگر لکھنے والا پوری حقیقت کے بیان سے کتراتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ اپنے قاری کو دھوکہ دیتا ہے۔

اخیر میں طفیل احمد صاحب نے زرعی پیداوار کے تجزیئے سے مندرجہ ذیل نتائج مرتب کئے ہیں:۔

۱۔ ہم اناج کے لحاظ سے خود مکتفی ہیں۔

۲۔ ہم اناج برآمد کرتے ہیں۔

۳۔ ہم پارچہ بافی اور شکر سازی کی عظیم الشان صنعت قائم کر سکتے ہیں۔

۴۔ ہم صنعت دوا سازی کی بعض اہم شاخیں کھول سکتے ہیں۔

۵۔ ہم پھلوں کو ڈبوں میں محفوظ کر کے اور رس اتارنے کی صنعت کو جاری کر سکتے ہیں۔

۶۔ لیکن ابھی خوراک کے لئے تجارت برآمد کو فروغ دینے کے لئے اور آئندہ قائم ہونے والی صنعتوں کے کام آنے کے لئے جدید طریقہ کاشتکاری کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔
آب پاشی کی توسیع جدید آلات کا استعمال اور کواپریٹو کاشتکاری یہی وہ جدید طریقے جنہیں محکمہ زراعت کام میں لا کر صوبے کی زرعی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہم آسمان کے تارے بھی نوچ سکتے ہیں لیکن کیسے؟ ان جدید آلات کے استعمال سے یا آبپاشی کی توسیع سے؟ اب اس سے زیادہ غلط بیانی کیا ہو سکتی ہے۔ طفیل صاحب معاشیات کے ماہر بنتے ہیں۔ انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہونا چاہیئے کہ جب تک ہمارے زمینی نظام میں ایک انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ اس وقت تک پیداوار نہیں بڑھ سکتی۔ آج جس کسان کو زمین سے بیدخل کیا جا رہا ہے۔ جس مزارعہ کو ایک طرف حکومت کے ٹیکس اور دوسری طرف زمیندار کی بیگار مارے ڈالتی ہے وہ کیسے اپنے ماتھے کے پسینے اور من کے پیار کو اس دھرتی میں ملانے کے لئے تیار ہو گا۔

طفیل صاحب نے جتنی بھی صنعتیں گنوائی ہیں وہ سبھی قائم ہو سکتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بھی

لیکن اس کے لئے ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کا معاشی ڈھانچہ بدلیں اور جاگیرداری کی لعنت کو ختم کریں۔ طفیل صاحب ان سب باتوں سے پوری طرح آشنا ہیں لیکن اس کے باوجود وہ دوسرا راگ الاپنے کے لئے مجبور ہیں۔

بہت وفادیبوں کو معاشی آسودگی کی خواہش اور اقتدار و شہرت کی ہوس رجعت اور ابن الوقتی کی راہ پر لے گئی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر ہوں یا وقار عظیم، یا ممتاز مفتی یا طفیل صاحب۔ نتیجہ ایک ہی ہے۔ ادبی موت اور عوام دشمن طبقے کی چاکری۔

آج جاگیردار حکمرانوں کا فلسفہ حکمرانی یہی ہے کہ کوئی چیز واضح نہ ہونے دی جائے اس لئے اگر ایک طرف حکومت پاکستان آئین بنانے میں لیت و لعل کر رہی ہے تو دوسری طرف اسلامی نظام کے نام سے ابہام پھیلایا جا رہا ہے۔ اور اس نظام میں رنگ بھرنے سے اسلامی حکومت اور نظام کا ہر مبلغ گریزاں ہے۔ مختار صدیقی صاحب نے بانئے پاکستان کے نام جو مضمون لکھا ہے۔ اس میں اسلامی نظام آن کرتان توڑی ہے۔ اچھا صاحب۔ اقبال نے تو پندرہ برس پہلے جب کہ ابھی ہم غلام تھے تو اسلامی نظام کا نام لیا تھا۔ اس وقت تو یہ دور کی بات تھی اس لئے اس میں رنگ بھرنے کی ضرورت فوری طور پر درپیش نہ تھی۔ مگر آج تو آزادی کا چرچا کیا جا رہا ہے۔ آج تو ہمیں اسلامی نظام کے نام لیتے وقت اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر مختار صدیقی کو آج بھی مضمون لکھتے وقت ان فقروں میں رنگ بھرنے سے گریزاں ہیں۔ نہ جانے وہ کیوں یہ بتانے سے کتراتے ہیں کہ اس نظام حکومت میں مختلف مسائل کا حل کیا ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مختار صدیقی صاحب کو اسلامی نظام سے اتنی ہی واقفیت ہے جتنی ڈاکٹر تاثیر کو جہاد کے مسئلے سے مگر چونکہ روپے وصول کرتے ہیں اس لئے مضمون لکھنا ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مضمون ادبی ہونا چاہیئے جس سے لوگوں کو تسلیاں دے کر بہلایا اور سلایا جا سکے۔

ایک مرض کے عنوان سے ایک مضمون شبیر محمد صاحب اختر نے لکھا ہے۔ اس میں اختر صاحب نے مہاجرین کے مسئلے کو نفسیاتی نقطہ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب جس وقت سرکاری اخبار کیلئے لکھنا پڑتا ہے تو اچھے سے اچھے ادیب کو بھی اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے کس قدر گریز کرنا پڑتا ہے اس مضمون کے بارے میں میری اطلاع ہے۔ کہ یہ خاص طور پر لکھوایا گیا تھا۔ اور ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب نے نہایت ہی تحقیر آمیز لہجے میں پناہ گزینوں کی غلط روی کو کوستے ہوئے کہا تھا کہ اس کے متعلق ضرور لکھیے

ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب کو ان پناہ گیروں کو کوسنے کی بجائے اس نیم براعظم کے سرمایہ دار اور جاگیردار سیاست دانوں کی پچھلے دس سال کی سیاست کو کوسنا چاہیئے تھا۔ یہ پناہ گیر ہندوستان و پاکستان کی غلط [illegible]
نہیں بلکہ پاکستان و ہندوستان کے قائدین پر ہے اور ان کا علاج کسی ماہر نفسیات کے CLINIC میں نہیں بلکہ ایک زبردست عوامی تحریک میں ہے۔

شبیر محمد اختر لکھتے ہیں۔

ہم مہاجرین کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جو عوام اور کسانوں کا ہے۔ جو وہاں بھی بے سروسامان تھے اور اب بھی ہیں۔ یہ لوگ دیہات میں جا کر آباد ہو چکے ہیں، اور اپنے اپنے آبائی پیشوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ زمین کے بیٹے ہیں اور پاکستان نے انہیں آغوشِ مادر میں کر اپنا لیا ہے۔ یہ لوگ کام میں لگے ہوئے ہیں، ہل چلا رہے ہیں اور اناج پیدا کر رہے ہیں۔

لیکن راجہ غضنفر علی وزیر مہاجرین کا اپنا کہنا ہے کہ ۲۸ لاکھ پناہ گیر بے یار و مددگار زمین اور ہل کے بغیر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ شیر محمد اختر صاحب نفسیات کے لئے Clinic کھلوانا چاہتے ہیں لیکن وہ اگر مختلف دیہات میں گھوم لیں تو ان کی تحریر حقیقت سے زیادہ قریب رہ جائے گی۔ آج اس مضمون کو اگر والٹن اور باؤلی کیمپ کا سٹیم ہمارے پڑھے تو وہ یہ نتیجے پر پہنچے گا کہ [illegible]۔ اختر صاحب تو بھوت نہیں پڑھتے۔ وہ یہ کبھی کہے گا کہ والٹن کے مقیم مریض نہیں بلکہ مریض ہمارے حکمران طبقے کی سیاست ہے۔

اس وقت تک استقلال کے جتنے بھی شمارے شائع ہو چکے ہیں اگر ان تمام شماروں کو سامنے رکھا جائے تو اس وقت کے تمام اہم مسائل کے متعلق حکمران طبقے کی پالیسی صاف طور پر مرتب ہو سکتی ہے، اور اس پالیسی کے تمام عوام دشمن خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ لکھنے والے اس پالیسی کے تمام خد و خال کو اچھی طرح سے پرکھیں اور پھر محسوس کریں کہ دس روپے فی کالم کے بدلے وہ عوام کو کتنا بڑا دھوکا دیتے ہیں، وہ اپنے فن کو بیچتے ہیں اور عوام کی آرزوؤں کو مسلتے ہیں۔

سب سے پہلے مہاجرین کے مسئلے کو لیجئے، آج کون نہیں جانتا کہ پاکستان کا بنیادی مسئلہ ان لٹے پٹے انسانوں کو آباد کرنا ہے اور آج مغربی پنجاب کا ہر ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جب تک کے ڈھانچے کو سرے سے بدل نہیں دیا جاتا اس وقت تک نہ تو ان لٹے پٹے انسانوں کو زمین میسر آ سکتی ہے، نہ پیداوار بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی خوشحال اور فارغ البال مستقبل کی طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا حکمران طبقہ اپنے اور فرسودہ جاگیرداری نظام کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے اگر ایک طرف مہاجرین کو نفسیاتی طور پر بیمار دکھایا جاتا ہے تو دوسری طرف بحالیات اور "تصویر کے دو رخ" قسم کے مضامین شائع کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سب ٹھیک ہے اور اس طرح سے عوام کی توجہ کو مہاجرین کے مسئلے سے ہٹانے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ کیونکہ جب تک عوام کی توجہ اس مسئلے پر مرکوز رہی ہے اس وقت تک حکمران طبقہ آسودگی محسوس نہیں کر سکتا اور یہ بھی یقینی ہے کہ جلد یا بدیر ہر دیانت دار پاکستانی کو یہ محسوس کرنا پڑے گا کہ پناہ گیروں کے اس فوری مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ جاگیرداری کا جلد سے جلد خاتمہ ہو۔ اور جاگیرداری کے خاتمے کے لئے جاگیرداروں کے پیسے اور اس کی سیاست دونوں کو شکست دینی پہلی شرط ہے۔

اس لئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ استقلال کے صفحات کو مہاجرین کے مسئلے پر غلط انداز سے روشنی ڈالنے کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ چنانچہ شمارہ ۱۴ میں کسی عباس احمد عباسی نے والٹن مہاجرین کے

کیمپ کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کئے ہیں۔ اس مضمون کے ساتھ کیمپ کی مختلف تصاویر اور اس کے ساتھ کیمپ میں لٹکے ہوئے مختلف کتبوں (Plaques) کی بھی تصویریں دی گئی ہیں ایک کتبہ یہ ہے

جنہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور شہید ہوئے، اللہ ان پر خوش ہوا، اور ان کے گناہ معاف کر دیئے۔

یہ صرف ہمارے ہاں کے دولت مندوں کا فلسفہ ہی نہیں بلکہ یورپ میں یہ فلسفہ بالکل رگیدا جا چکا ہے یہ تو پچھلی صدی کے وسط میں جب انقلابی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ جب سرمایہ دار طبقے کو مزدوروں نے پہلی دفعہ للکارا تھا۔ اور کمیونزم کے طوفان سے پہلی دفعہ آمنا سامنا ہوا تھا تو یورپ کے پادریوں نے انجیل نکال کر دکھائی تھی کہ سرمایہ دار تو دوزخ میں جائے گا اور غریب کے لئے جنت۔ کہ کشادہ کمرے اور دیدہ و عریض باغ ہوں گے۔ چنانچہ انجیل کا یہ مقولہ بہت ہی عام ہوا تھا۔

سوئی کے ناکے سے اونٹ گذر سکتا ہے۔ لیکن دولت مند جنت میں داخل نہیں ہو سکتا

یہاں بھی یہی حالت ہے کہ دنیا کی راحتیں سرمایہ دار طبقے کے لئے وقف اور ایک اور دنیا کی راحتیں مفلوک الحال عوام کے لئے۔

چنانچہ پہلے ہی شمارے میں عبدالمتین عارف صاحب کی ایک نظم "مفلس دوست کے نام" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی مفلسی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

شکر معبود بجا لا کہ لبھد فخر و غنا
اس نے یہ پھول بکھیرے ہیں تیری قدموں پہ
اور ان پھولوں کی رنگین و ساطت سے تجھے
فوقیت بخشی ہے دنیا کے شہنشاہوں پر

اپنی ناداری چھپانے سے تجھے کیا حاصل
اپنی غربت کو نہاں رکھ کے تجھے کیا لینا
تیری عسرت سے عیاں ہیں تیری عظمت کے نقوش
اپنی عسرت کو نہاں رکھ کے تجھے کیا لینا

اب اس نظم میں عبدالمتین عارف یہی کہنا چاہتے ہیں جو ہمارے علمائے کرام وہ تو عزوہ میں تشت دائو زلو میں قدشا کی بہت ہے کہ [illegible] و غربت کا جواز ڈھونڈا گیا ہے۔ اور جن لوگوں کو روٹی کے چند ٹکڑے میسر نہیں ان کو اشعار سے بہلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب نہیں عارف صاحب کی نظم "پنجاب" جو سالنامہ ادب لطیف میں شائع ہوئی ہے کہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

وہ دیکھتے ہو اک احمریں سا غبار افق پر ابھر رہا ہے

غلط قیادت کا سحر تاریک ایک لمحے کا میہماں ہے

ابھی اٹھیں گے یہ میرے غیور بیٹے آنکھوں میں انتقام و غضب کے شعلوں کا رقص لیکر

اور اس خس و خار پیشوائی کو پھونک ڈالیں گے ایک پل میں

یہ موری ڈاکٹر تاثیر جیسے کہنہ مشق اصحاب کے شایان شان ہو تو ہو۔ لیکن عبد المتین عارف جیسے بھلے چنگے انسان اور ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے یہاں اس قسم کا تضاد کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

استقلال میں کچھ نظمیں بغیر شاعر کے نام کے شائع ہوتی ہیں۔ ان میں ایک نظم ہے "گیتوں کے متوالے"۔ اس پر شاعر کا نام نہیں دیا۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے مصنف قتیل شفائی ہیں، وہی قتیل شفائی جیالدار کے مصنف۔ اس "گیتوں کے متوالے" میں پنجابی کسان کی ایک بہت ہی بھلی تصویر کھینچی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

یہ پنجاب کے البیلے، یہ گیتوں کے متوالے

یہ الہڑ دہقان یہ چوڑے چکلے سینوں والے

غم کے بیری چھیل چھبیلے موہنجوں کے کھولے

پنجابی کسان البیلا بھی ہے، الہڑ بھی ہے، چوڑے چکلے سینہ والا ہے۔ لیکن پنجابی کسان آج ادھ موا ہو رہا ہے۔ اس کو زمین نہیں مل رہی۔ اس کو بٹائی کا پورا حصہ مل رہا ہے۔ وہ اپنے خون پسینے سے گندم سینچتا ہے لیکن زمیندار ہتھیائے جاتا ہے۔ اور اسے پھر اسی گندم کو جو اس کی اپنے گاڑھے پسینے کی پیداکی ہوئی ہے چور بازار سے لینا پڑتی ہے۔ قرض نے اس کی کمر توڑ دی ہے۔ زمیندار کی بے گاروں اس کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیا ہے اور اب تو وہ صرف انسانیت کی ایک لاش ہے جس کو دیکھ کر ہر حساس انسان کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور اس حکمران طبقے کی کرتوت صاف عیاں ہو جاتی ہے۔

قتیل شفائی غالباً ہری پور ہزارہ کے رہنے والے ہیں آج ان کو اسی ہزارہ میں کسانوں کی تکالیف کا پتہ ہو گا۔ ان کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان کسانوں نے وہاں کے خوانین کے مظالم سے تنگ آ کر علم بغاوت بلند کر دیا ہے آج نہ وہ صرف یہ کہ بٹائی دینے سے انکار کر رہے ہیں بلکہ فضاؤں میں یہ نعرہ بھی گونج رہا ہے کہ جو بوئے سو کاٹے۔ لیکن اس کے باوجود قتیل شفائی کے ان اشعار میں حقیقت سے گریز کیا گیا ہے۔ غلط تصویر کھینچی گئی ہے۔

کاش، ہمارے پنجاب کا دیہاتی اتنا ہی خوش ہوتا جتنا قتیل شفائی کے اس گیت میں ہے۔

چوتھے شمارے میں مہاجر کے عنوان سے بھی ایک نظم شائع ہوئی ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے

غربت نے بنایا ہے غیور اور زیادہ

چھٹتا ہے پھٹے کپڑوں سے نور اور زیادہ

کافی ہے خدا کا انہیں دنیا میں سہارا
جو اس کی رضا ہو وہی ان کو ہے گوارا

غریبوں کو غیرت عطا کی جا سکتی ہے۔ ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے نور چھن سکتا ہے مگر ان کو معاشی آسودگی میسّر نہیں ہو سکتی۔ مفلوک الحال عوام کو شعروں سے بہلایا جا رہا ہے۔ مگر بغاوت کے شعلے ایسے شعروں سے بھی کبھی دبے ہیں۔ اور پھر عام انسان کی توہم پرستی اور جہالت سے یوں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ یہی اس کی رضا ہے۔ انسان کیا کر سکتا ہے۔ خدا کو پچانوے فی صدی کی غربت اور پانچ فی صدی کی امارت گوارا ہے۔ اور یہی خدا کی رضا ہے۔ تو پھر خدا بھی دو ہیں حکمرانوں کا خدا اور ایک ہمارا۔

جس وقت عام انسان اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اور حکومت سے شاکی ہوتا ہے۔ تو ممتاز مفتی صاحب 'پالتو شکایت' کے عنوان سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مفتی صاحب کیوں بھول گئے ہیں کہ وہ ان عام انسانوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جنہوں نے ان حکمرانوں کو حکومت کی مسند پر بٹھایا ہے اور وہ سورج بھی طلوع ہونے والا ہے۔ جب عوام کسی کو مسند پر نہیں بٹھائیں گے بلکہ خود آگے بڑھیں گے اس وقت حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ممتاز مفتی صاحب کے ماتھے پر بھی پسینہ ٹپکتے نظر آ رہے ہوں گے۔ کیا ادیب کی موت نہیں کہ وہ عام انسانوں کی جائز خواہشات پر پھبتیاں کسے ان کے مطالبات کا مضحکہ اڑائے۔

آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار میری شاعری، میرا احساس

چاندی کے ترازو میں صرف ممتاز مفتی کا فن ہی نہیں تل رہا بلکہ ان کے قیوم جیسے شاعر بھی ہیں، جو سیاست کے الفاظ سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتے تھے۔ منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتے تھے اور پراپیگنڈا نعرے ہنگامی شاعری کے القاب سے اس ادب کو یاد کرتے تھے۔ مگر آج ان کو بھی نوجوانوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ جو کل تک ادب برائے ادب کے پرستار تھے۔ مگر اب ان کو چند روپیوں کی خاطر ایسی نظمیں لکھنی پڑتی ہیں جو کسی ہمہ۔لی قسم کے روزنامے میں چھپنی چاہئیں۔

بہرحال یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

ہاں اس داستان کا ایک اور باب ہے۔ اس طرف بھی ہمارے لکھنے والوں نے توجہ نہیں کی ورنہ وہ سیاست اور عوام دوستی کے جذبے سے نہ سہی تو کم از کم اپنے فن کی حفاظت اور نشو و نما کے لئے ہی استقلال کے زہریلے اثرات کو بھانپ جاتے۔

استقلال نے ہمارے لکھنے والوں کو فنی اونچائیوں سے گرا کر چالو قسم کی تحریریں لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ ممتاز مفتی کی کہانیاں اور منٹو کے مضامین اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ یہ ادیب جو اپنے خون سے اپنے فن کی شمع کو جلانے کے دعویدار تھے۔ آج وہ کیا لکھ رہے ہیں، اور وہ یہ محسوس نہیں کر رہے کہ وہ کتنے خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔

ہمارے لکھنے والوں نے اپنی ایک دنیا بنا رکھی ہے جس کے باہر جھانکنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ اور ترقی پسند ادیب بعض وقت کنی کترا جاتے ہیں۔ ہمارے لکھنے والے عوام کی جہالت اور توہم پرستی کو دور کرنا چاہتے ہیں

کیونکہ اگر عوام ان امراض سے گلو خلاصی حاصل کرلیں تو ادب کو مہلت مل سکتی ہے اور قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔ لگا استقلال میں لکھنے والے کتنے ادیبوں نے اس کے پیچھے کام کرنیوالی طاقتوں کا جائزہ دیا ہے۔

معلوم نہیں لکھنے والے اس واقعہ سے متاثر ہوں یا نہ ہوں بہرحال میں خود متاثر ہوں اسی لئے میں اسے تحریر کرتا ہوں کہ جس چکنے اور سفید کاغذ پر استقلال چھپ رہا ہے یہ کاغذ ہمارے بھائیوں اور بچوں کے نصاب کے لئے پڑا ہوا تھا۔ کیونکہ آج پورے پاکستان میں سفید کاغذ کی زبردست کمی ہے مگر سفید کاغذ کے تقریباً ہزار رم کو استقلال کے لئے حکومت نے وقف کردیا۔ حکومت کا خیال تھا کہ شاید جس اقتصادی و سیاسی بحران میں وہ پھنسی ہوئی اس سے حسن عسکری، قیوم نظر اور ممتاز مفتی کی تحریریں نکال لیں گی۔ اس لئے حکمرانوں نے بچوں کی تعلیم کو پس پشت ڈالتے ہوئے استقلال کے فوری اجرا کا اعلان کردیا ہے۔

چنانچہ آج اس کا نتیجہ عیاں ہے، اور اس نتیجے کو بھی لکھنے والوں نے شائد دیکھنے سے احتراز کیا ہو۔ کہ ہمارے مدارس دفتروں اور مغلوں بند پڑے ہیں کیونکہ نصاب کی کتابیں میسر نہیں آ رہی تھیں اور اب جو چھپ بھی رہی ہیں۔ وہ Print News پر چھپ رہی ہیں۔ نصاب کی کتابیں جنہیں بچوں نے سال بھر بلکہ بعض دفعہ دو دو سال استعمال کرنا ہے۔ وہ تو Print News پر چھپیں لیکن استقلال جسے پڑھنے والے آدھ پون گھنٹے کے بعد ردی میں بیچ دیتے ہیں۔ اس کے لئے چکنا اور سفید کاغذ چاہیے۔ تاکہ پہلی نظر میں جھوٹ جھوٹ نہ معلوم ہو۔

یہ ہے صورت حال۔ مجھے احساس ہے کہ یہ تبصرہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے ماہ نو اور جاوید اور آمد وغیرہ کسی دوسری صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ بہرحال اس وقت لکھنے والوں پر ایک بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ حقیقت سے منہ موڑ کر اس قسم کا ادب پیش کرتے ہیں جس سے زندگی کے دکھ اور سکھ ذرا بھی اجاگر نہ ہوں۔ جس سے ہمارے عوام آگے قدم نہ بڑھائیں تو وہ یقینی طور پر ادب سے اپنے آپ سے اور اپنے قاری سے دھوکہ کرتے ہیں۔

اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک فانی اور گلے سڑے طبقے کے ادب سے بدبو آتی ہے۔ اور وہ کبھی پائندہ نہیں ہوسکتا۔ لافانی ادب وہی ہے جو لافانی عوام کے لئے وجود میں آتا ہے۔ پرانے دربار مٹ گئے۔ نئے دربار بھی مٹنے والے ہیں۔ افق کے تیور یہی کہہ رہے ہیں۔

ناصر کاظمی

غزل

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے ہیں خیال
بجھے بجھے سے ہیں آنکھوں میں غم کے افسانے

بقدرِ تشنہ لبی پرسشِ وفا نہ ہوئی
چھلک کے رہ گئے تیری نظر کے پیمانے

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
کئی دنوں سے سلگتے ہیں دل کے ویرانے

امیدِ پرسشِ غم کس سے کیجیے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

سلیم واحد سلیم

غزل

تری محبت میں ہم نے اکثر کچھ اس طرح وقت بھی گزارا
کہ تابِ غم تک نہ تھی میسر مگر سکوں بھی نہ تھا گوارا

تجھے مبارک ہو امنِ ساحل تجھے مبارک ہے کنارا
میں ڈوبتا ہوں تو ڈوبنے دے نہ دے سہارا نہ دے سہارا

مجھے جنونِ طلب نے لوٹا مجھے مری گمرہی نے مارا
وگرنہ دل سے کسی نے پیہم کبھی صدا دی کبھی پکارا

نظر نظر بے قرارِ جلوہ مگر کہاں طاقتِ نظارا
جو ہو سکے تو مری نگاہوں کو اپنی نظروں سے دے سہارا

پلا بھی ساقی کہ غم کے ہاتھوں جگر ہے خوں دل ہے پارا پارا
سکوں کے لمحے تو ہوں میسر عذابِ دوزخ مجھے گوارا

سلیم دیوانے زندگی میں بہت سی طغیانیاں بھی آئیں
بہت سے میں نے تھپیڑے کھائے مگر بھی حوصلہ نہ ہارا

"ادیب اور تقسیم ہند ---!"

"ادیب اور ریاست سے وفاداری ---!"

ان دو عنوانوں کو لیکر لاہور کے ایک ہفتہ وار پرچہ نے ایک نہایت دلچسپ اور معنی خیز ادبی بحث چھیڑی ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ کا آغاز سہیل عظیم آبادی نے کیا۔ اور پاکستان اور ہندوستان کے مختلف ادیبوں نے اس پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اب تک اس بحث میں حسن عسکری، سہیل عظیم آبادی، عبداللہ ملک، میرزا ادیب، ہندستانی وغیرہ حصہ لے چکے ہیں۔ اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ذہنی پس منظر کو سمجھے بغیر بحث کو اُلجھا دیا گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے گذشتہ پرچہ میں ذکر کیا تھا کہ تقسیم ہند اور مذہبی فسادات نے ہمارے ادیبوں کی صلاحیت اور ان کے پوشیدہ رجحانات کو بڑی سچائی کے ساتھ منظر عام پر لا پھینکا ہے۔ اور جمہوری قبا تار تار ہو کر اپنے پہننے والے کے خد و خال کو نمایاں کر چکی ہے۔ اس ادبی بحث میں بھی مجھے یہی نظر آ رہا ہے۔ کہ ہم ادیب لوگ (بقول حسن عسکری) بڑی تیزی کے ساتھ دو کیمپوں میں جا رہے ہیں۔ اور ہماری تحریک کی صحت و ما نشو و نما کے لئے یہ لازمی بھی ہے۔ کہ ہمارا کیمپ منتشر سے منتشر ادیبوں کا معمورہ بن جائے۔ اور ہم فروعی اُلجھنوں سے نجات پا کر نئے نئے اقدامات کر سکیں۔

ایک دلچسپ اور حیرت خیز حقیقت دیکھنے میں آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندیونین کا رجعت پسند طبقہ اور پاکستان یونین کا رجعت پسند طبقہ، دونوں اپنی اپنی ریاستوں میں ترقی پسند ادیبوں کو تشفیۂ کلام کا بظاہر خوفناک لیکن بباطن کھوکھلا طعنہ دینے میں ایک ہی سطح پر آ گئے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے دونوں ریاستوں کے سیاسی فلسفہ کا تجزیہ کر کے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آخر اس قدر گھناؤنی نفرت اور ظالمانہ تضاد کے مظاہرے کے بعد دونوں ریاستوں کے خداوندوں میں یہ ہم آہنگی کیوں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ریاست سے وفاداری کی طلسم ناک لہریں پیدا کر کے عوام کو بنیادی تقاضوں سے دور ہٹایا جا رہا ہے۔ اور ادیب اور عوام کی ترقی پسند مناسبتوں کو ابہام کے پردے میں لپیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے حسن عسکری لکھتے ہیں، کہ انسانیت پرستی اور انسان مبہم اور گول مول لفظ ہیں۔ یہ کہنے سے عسکری کا کہیں یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ اپنے ابہام کے جُرم کو چھپانے کے لئے انسانیت جیسی عظیم حقیقت کو مبہم ٹھہرا دیں۔ اور اس طرح بورژوا فلسفۂ حیات کی ادبی ترجمانی کا فرض ادا کریں؟

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ رجعت پسند ادبی نظریہ سازوں کے سامنے ریاست سے وفاداری کا کوئی واضح اور معین معیار نہیں ہے۔ ہم ترقی پسند ادیب تو خیر مرتد ٹھہرے۔ ہم ریاست سے وفاداری کو ہی زندگی کی آخری کڑی نہیں سمجھتے۔ اور ان لا زوال وفاداریوں سے گذر کر انسانیت جیسی مبہم منزل تک پہنچنے کی حماقت کر رہے ہیں۔ لیکن عسکری صاحب جو آج ریاست سے وفاداری کی دُھن میں کلچر، تمدن اور آرٹ کی سبھی منزلیں پھلانگ جاتے ہیں۔ اپنی وفاداری کی کسوٹی سے خود بھی آگاہ نہیں۔ یا اگر آگاہ ہیں بھی تو بکارِ خویش ہوشیار کی حد تک۔ گذشتہ اکتوبر میں، جب پاکستان کے فن کاروں کی طرف سے ایک اعلان نامہ شائع ہوا!

تھا۔ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ عسکری صاحب نے اس اعلان نامہ پر اس لئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہ وہ پاکستان کے ادیب ہیں ہی نہیں۔ وہ تو انڈین ڈومینین کے وفادار ادیب ہیں۔ اور اب جبکہ وہ انڈین یونین کی غیر معیاری وفاداری کی حد پھلانگ کر پاکستان یونین کی وفاداری کے راگ الاپ رہے ہیں۔ انہیں وضاحت کے ساتھ اپنے اس متضاد سلوک پر غور کرنا چاہئے۔ کہ ان دونوں ریاستوں میں سے فنکار عسکری کا تہذیبی تعلق اور ادبی ناطہ کس کے ساتھ زیادہ ہے، اور کس کے ساتھ کم۔ یا ان میں سے کس کے ساتھ وہ واقعی وفادارانہ عہد کو استواری کی حد بخشنے پر تیار بھی ہو سکتے ہیں یا کہ نہیں۔ کیا عسکری صاحب کے پاس پاکستان کا وفادار شہری بننے کے لئے سوائے "مذہب" کے کوئی اور تہذیبی یا ادبی یا علاقائی جواز بھی ہے کہ نہیں۔ اور اگر "مذہب" ہی ریاست سے وفاداری کی کسوٹی ہے۔ تو کیا وہ پاکستان کو ایک مذہبی سٹیٹ کہنے کی تاریخی جرأت کر سکیں گے؟ کیونکہ ایسا کہہ دینے سے ان پر سیاسیات سے کورا ہونے کا لیبل لگنے جانے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے؟

جب عسکری یہ کہتے ہیں، کہ ملک کی آزادی اہل دماغ طبقے کی مدد کے بغیر عالم وجود میں آگئی۔ تو اس وقت وہ جان سے ماضی کے سیاسی ارتقا کی مسلسل تصویروں کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ کیا۔ کھل جا سم سم کہنے سے کسی سحر انگیز لفظ کی بدولت یہ آزادی وجود میں آگئی؟ کیا وہ ان ادبی شہ پاروں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر اگست ۱۹۴۷ء تک عوام کے ذہنوں کی خروش میں پیوست چلے آتے ہیں۔ یہ الزام "عوام سے کٹ کر کنج تنہائی میں زندگی گزار دینے والا کوئی ادیب لوگ" تو دے سکتا ہے۔ لیکن ترقی پسند ادیب جو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور معمولی سے معمولی عمل کو بھی اپنے ادراک کی سطح پر رقص کرنے کے لئے لے آتے ہیں۔ کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ انہیں اپنے اور عوام کے شعوری ارتقا کا احساس بھی ہے اور اس پر فخر بھی۔ وہ سماج کی تدریجی زندگی کے ہر پیچ و خم سے آگاہ ہیں۔ اور اس آگاہی میں ان کے ابہام کو نہیں بلکہ دھڑکتے پھڑکتے عمل کو دخل رہا ہے۔

عسکری نے ترقی پسند ادیبوں پر ایک اور الزام بھی لگایا ہے۔ کہ وہ مسلمان "قوم" کو نہرو اور پٹیل کے قدموں پر لا ڈالنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ عالم خواب کے فیصلے عسکری صاحب کو زیب نہیں دیتے۔ آج تک کسی ترقی پسند ادیب کی تحریر میں انڈین یونین کے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام حکومت کے حق میں آواز بلند نہیں کی گئی۔ رجعت پسند اب ہندو اور مسلم کا افتراق انگیز نعرہ دیکر ترقی پسند تحریک کی واضح لکیروں پر ایک خراش بھی نہیں ڈال سکتے۔ ہمارا نقطۂ نگاہ صاف ہے کہ دونوں ریاستوں پر عوام دشمن قوتیں مسلط ہیں۔ آزادی ملنے سے آئینی ڈھانچہ یا سرمایہ دارانہ فلسفۂ حیات تو نہیں بدل گیا۔ دونوں ریاستوں کے عوام آج بھی بھوکے ہیں "ننگے" اور کساد بڑھتا جا رہا ہے۔ اضطراب اور بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کی نظریں اس اضطراب مسلسل کے پیچھے تیزی اور شدت کے ساتھ آتے ہوئے، شور مچاتے ہوئے عوامی انقلاب کی دھمک محسوس کر رہی ہیں۔ جاگیردارانہ فلسفہ اپنے اندرونی تضاد سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ "مذہب" نے اسے ہنگامی سہارا دے دیا۔ لیکن وہ تضاد مر نہیں سکتا۔ چاہے لاکھوں مذہب پرست فن کار اسے سلجھا دینے کی کوشش کریں۔ اور اسی تضاد کا شکار ہو کر رجعت پرستی کا بت پاش پاش ہو جائے گا۔ اور اس کے اندر سے ابلتی اچھلتی ہوئی عوامی زندگی باہر نکل آئے گی۔ جسے نہ نہرو روک سکے گا، نہ پٹیل۔ نہ نواب روک سکیں گے نہ مولوی اور پنڈت۔ اور پھر اس کے بعد ہی ترقی پسند ادیب، آپ سے اس طعنے اور الزام کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جس کی رو سے آج آپ انہیں نہرو اور پٹیل کا بہی خواہ دکھاتے ہیں ہنہ۔ ہیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کو ریاست کا وفادار ہونا چاہئے۔ تو اس وقت سب سے اہم اور اہم ضرورت ریاست کے حالیہ ڈھانچے اور اس کی ترتیب و تشکیل، اس کی ہیئت اور اس کے معاشی اور سیاسی رجحانات کو دیکھنے کی ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی ریاست

کے آئینی ڈھانچے اور اس کے اثرات و مطالبات پر غور نہیں کرینگے۔ ہم کسی ادیب کو مجبور نہیں کرسکتے۔ کہ وہ وفاداری کا دم چھلا لگائے پھرے۔
میرے خیال میں یہ نظریہ غلط ہے کہ وفاداری ماحول کے تغیر یافتہ عناصر کے تحت اپنی شکلیں بدلتی ہے۔ ہمیں وفاداری کو جذباتی فضا سے الگ کرکے سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے دیکھنا پڑیگا۔ لیکن اس نقطۂ نگاہ کے ساتھ دیکھنے سے پہلے ہمیں ایک اور فیصلہ بھی کرنا پڑیگا۔ کہ ادیب اور ادب کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ اور ادب کا ریاست سے کیا رشتہ ہے۔ اگر ہم جمہوریت اور انسانیت جیسی عظیم حقیقتوں کو مبہم اور گول مول ٹھیرا لیتے ہیں۔ تو پھر نہ تو ادب کے بنیادی مقصد کو سمجھنے کی ضرورت لاحق رہتی ہے۔ اور نہ ہمیں ریاست۔ کے ساتھ ادیبوں کے رشتہ کی کڑی تلاش کرنے کی زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ ادب کے مقصد میں ایک وسعت لازمی ہوتی ہے۔ ہم ایک گول گنبد میں بیٹھ کر ایک شعر یا ایک افسانہ لکھ کر آرام کی نیند سو جائیں، تو اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی ہر تخلیقی لہر کو ابھرنے سے پہلے ہی دبا دیں۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان کسی مبہم جگہ پر معلق ہوکر منجمد ہوجائیں۔ لیکن اگر ادیب ان تمام لوگوں کے دکھ درد کا رفیق ہے۔ جو ہمارے ارد گرد اربوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سیاسی، معاشی اور تمدنی تضاد، بموں، ٹینکوں اور توپوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور جنہیں برتر طاقتوں نے بھیڑوں کا گلہ سمجھ کر اپنے اپنے راستے پر چلانا اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اور اگر سماج اور سماج کے عوامل ہماری ادبی تحریکات کا نتیجہ بنتے ہیں تو لازماً ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ادب عوام کے لئے ہوتا ہے۔ ہونا چاہیئے اور ہوتا آیا ہے۔ کوئی انٹرمیڈیٹ کا طالب علم اس ادبی غایت کو سمجھ سکے یا نہ، مگر میرا خیال ہے عسکری اس نظریاتی نکتے کو ضرور سمجھتے ہیں۔ اور اگر نہیں سمجھتے تو پھر ایک بار مجھے کہنا پڑیگا کہ وہ بکار خویش ہشیار ہیں۔

ریاست کی ترکیب انہی عوام سے ہی عمل میں آتی ہے۔ عوام کے ہی معاشی، سیاسی، تمدنی اور سائنسی تقاضوں کا مجموعہ ایک ریاست کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس لئے منطقی طور پر ہمیں عوام ہی کو ریاست اور ریاست کو عوام ہی سے تعبیر کرنا پڑیگا۔ اور جب کوئی ادیب ریاست سے وفاداری کے متعلق کوئی نقطۂ نگاہ معین کریگا۔ تو اسے سب سے پہلے اپنی وفاداری کا محور عوام کو بنانا پڑے گا کیونکہ عوام سے کٹ کر اس کی وفاداری سوائے بے معنی شور و غل اور کھوکھلی نعرہ بازی کے اور کسی بھی حیثیت کی حامل نہیں ہوگی۔

اب ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے عوام، ان کے تقاضے اور دونوں ریاستوں کے سیاسی رجحانات اور ان رجحانات کا عوام پر براہ راست اثر اور اس اثر کے نتائج کا تجزیہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم جب دونوں ریاستوں کے ادیبوں کے بارے میں وفاداری کا کوئی فیصلہ کرنے لگیں تو ہمیں اپنے گرد و پیش کا صحیح اندازہ رہے۔

اگر دونوں ریاستوں کو ہم ان کے "قومی نعروں" سے الگ کرکے دیکھیں۔ تو پس منظر میں چند گھناؤنی کیفیتیں نمایاں ہوجاتی ہیں۔ اول تو جن بنیادوں پر آزادی حاصل کی گئی، ان بنیادوں میں عوام کی تمناؤں کی دھڑکنیں شامل نہیں کی گئیں۔ ماؤنٹ بیٹن سے سمجھوتہ بازی عوام کی سالہا سال جد و جہد کے ساتھ غداری کے مترادف تھی۔ اور چونکہ برسر اقتدار طاقتوں نے عوام کے لئے جس نوعیت کی آئینی پالیسی وضع کی وہ بذات خود اس قدر رجعت پسندانہ ہے۔ جس سے مستقبل کے حسین لمحات کی توقع رکھنا لاحاصل ہے۔ عوامی ذہن کو الجھانے کے لئے گرد و پیش میں کئی بکھیڑے کھڑے کردئے گئے ہیں، پناہ گزینوں کا مسئلہ، فرقہ وارانہ منافرت کا مسئلہ، کشمیر کا مسئلہ، حیدرآباد کا مسئلہ اور سب سے زیادہ قومی حکومتوں کو مضبوط کرنے کا مسئلہ —— ان سب مسئلوں سے عوامی شعور، و بغاوت کشی کو دبانے اور اس کا رُخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے گویا معماروں نے دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے۔ پھر ہم عمارت کے متعلق خوبصورت "وفاداری" کے طلسم کو اپنے دماغوں میں کیونکر جگہ دے سکتے ہیں۔ ہمارا تعلق عوام سے ہے۔ اور عوام ان ریاستوں کے موجودہ آئینی ڈھانچوں اور طریق کار سے مطمئن ہو ہی نہیں سکتے۔ چاہے کتنے ہی جذباتی نعروں سے اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا جائے۔ مگر

عوام کو چین نہیں مل سکتا۔ اور جب عوام کو چین نہیں ملے گا۔ تو عوام کے ادیبوں کو بھی چین نہیں ملے گا کیونکہ ادیب برسرِ اقتدار طاقتوں کا نقارچی تو ہے نہیں۔ کہ اُن سے چین پر اپنی بنسری کی دُھنیں سُنا سکے۔ اُن کے گیت گا سکے۔

پھر وفاداری کا کیا بنے گا؟

میرے خیال میں ادیب کی وفاداری عوام اور اُن کے مفاد کے پیشِ نظر بالشبہ تمام حکومت کے ساتھ ہی وابستہ ہونی چاہیئے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب موجودہ حالات میں عوام اور اُس کے بنائے ہوئے نظامِ حکومت کا وجود نہیں ہے۔ ادیب کی وفاداری کا کیا بنے گا؟ کیا وہ غیر جانبدار رہے؟ اور میں کہوں گا کہ ادیب غیر جانبدار تو کبھی نہیں رہ سکتا کیونکہ جمہوریت کی جدوجہد میں عوام کا ساتھ دینا اور نظامِ حکومت کو اس معیار پر لانا جس سے اس کی وفاداری کا صحیح ماحول پیدا ہو سکے۔ اس کا ضروری مقصد ہونا چاہیئے۔ اس لئے ہمیں موجودہ سماجی اور سیاسی زندگی میں ادیب کا اپنی ریاست کے حق میں فرض نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی ریاست کا وفادار ہے۔ صرف اسی لئے۔ تاکہ اپنی ریاست میں اپنی ادبی جنگ کے ذریعے اس انقلاب کے مراحل طے کئے جا سکیں۔ جو دونوں ریاستوں کے عوام کو نفرت کی بجائے محبت سکھائیں۔ اگر آج کوئی ادیب ہندوستان اور پاکستان یونین کے تہذیبی اور علمی شعبہ پر نظامت حاصل کر کے اقتصادی اعتبار سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور برسرِ اقتدار گروہ کی طاقت کے راگ الاپنے لگتا ہے۔ تو ہمارے خیال میں وہ ادب اور عوام کے بنیادی فلسفہ کی نفی کرتا ہے۔ جوش ملیح آبادی اور دیوندر ستیارتھی پٹیل کے شعبہ نشر و اشاعت میں ملازمت آج کل کے ایڈیٹر بن جائیں۔ یا راجندر سنگھ بیدی ریڈیو پر ڈائرکٹر ہو جائے۔ ڈاکٹر تاثیر اور بخاری سرکاری ملازمت کو وفاداری کا معیار سمجھ لیں۔ یا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری گورنمنٹ کے تعلیمی شعبہ کا انچارج بن جائے۔ اگر یہ تمام ادیب ایک لمحہ کے لئے بھی اس آنے والی عوامی جنگ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور خلوص اور سچائی کے ساتھ موجودہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ حکومتی طاقتوں کو عوامی دکھوں کا علاج سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ہمارے خیال میں وہ ترقی پسند ادب کے فلسفہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اور عوام کے حق میں اسے ایک فنکارانہ جرم سے تعبیر کیا جانا چاہیئے اور اگر عوام کو ان کی تخلیقات سے اپنے ارتقاء کے لئے اشارے نہیں مل سکتے۔ تو انہیں ترقی پسند ادبی تحریک کی صفوں سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ اور تب تک الگ رہنا چاہیئے۔ جب تک وہ ریاست سے وفاداری کا صحیح مفہوم نہ سمجھ پائیں۔ حسن عسکری کی بات اور ہے۔ وہ تو ترقی پسند ادیبوں کو فتنہ کا مسئلہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے خود کبھی عوام میں آنا اور اپنی تخلیقات پر عوام کی چھاپ لگانا گوارا نہیں کیا۔ مگر وہ ادیب جو ترقی پسند تحریک کے ستون رہے ہیں۔ اگر موجودہ حالات میں کروٹیں بدل کر اپنے نظریۂ ادب کو بدل دیتے ہیں۔ تو ترقی پسند ادبی تحریک اُن سے وہی سلوک کرے گی جو راہل سنکرتائن جیسے مہاپنڈت کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ادب میں مہاپنڈت پن سے واضح اور مخلص ذہن کی نظریاتی فضا زیادہ اہم ہوتی ہے۔

تین نظمیں

احمد ظفر

رات:- کون آئی ہے سیہ ملبوس میں ماتم کناں
مدفنِ مغرب میں جب سورج کو دفنایا گیا!

دلہا:- اک ابر جو کھُل کر برسے گا

بڑھاپا:- کون سائے میں تھک کے بیٹھ گیا

عبدالمتین عارف

ڈیڈ لاک

مجھے چاند تاروں کی مدھم ضیا سے ہے رومان افروز بے لوث الفت،
میں سورج کی تیکھی شعاعوں سے بھی منسلک کر چکا ہوں گھنیری عقیدت،

میں صحراؤں کی وسعتوں میں اگر جذب ہو جاؤں تسکین کی راہ پاؤں،
اگر میں سمندر کی اک موجِ رقصاں میں ڈھل جاؤں، جنت کو ٹھوکر لگاؤں

مری زندگانی کا مقصد ہے میں کوہساروں کی رفعت سے نظریں ملاؤں،
یہ میدان اپنی دُھلی نُزہتوں کے سبب میری تخئیل میں رچ گئے ہیں

یہ دیرینہ ارماں ہے میرا کہ میں بزم کی عشرت آرائی میں ڈوب جاؤں
یہ پارینہ حسرت ہے میری کہ میں رزم کی حشر پیرائی میں کود جاؤں۔

—— میں پتھر کے مانند بے حس پڑا ہوں!

ہماری نئی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	چھ روپے آٹھ آنے
ایک بات	″ ″	تین روپے
سیف و سبو	جوش ملیح آبادی	پانچ روپے
آیات و نغمات	″ ″	پانچ روپے
جنون و حکمت	″ ″	پانچ روپے
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	چار روپے آٹھ آنے
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری	چار روپے
چُپ	ممتاز مفتی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ	تین روپے آٹھ آنے
نیا اُفق	ہنسراج رہبر کے تازہ افسانوں کا مجموعہ	دو روپے آٹھ آنے
ہیولے	فکر تونسوی کی نظموں کا مجموعہ	دو روپے چار آنے
قیدِ حیات	اپندر ناتھ اشک کے تازہ ڈراموں کا مجموعہ	دو روپے
۴۶ء کی بہترین نظمیں	حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کا سالانہ انتخاب	ڈیڑھ روپیہ
کرنیں	شفیق الرحمٰن کے افسانوں کا نیا اڈیشن	چار روپے
منٹو کے افسانے	منٹو کے افسانوں کا نیا اڈیشن	چار روپے
ہریالی	قتیل شفائی کے گیتوں کا مجموعہ	ڈیڑھ روپیہ
سحر ہونے تک	ناصر شمسی کے تازہ ڈراموں کا مجموعہ	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم کا مشہور و معروف ناول	تین روپے چار آنے
لمحاتِ رنگیں	زبیدہ سلطانہ کے افسانے	دو روپے
۴۷ء کا بہترین ادب	ادارۂ ادبِ لطیف	چھ روپے
باسی پھول	علی عباس حسینی	دو روپے آٹھ آنے
میلہ گھومنی	″ ″	تین روپے
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	دو روپے
زندگی کے موڑ پر	″ ″	دو روپے
ماورا	ن۔ م۔ راشد	دو روپے آٹھ آنے
انتہا پسند کمیونزم	(لینن)	دو روپے

اُردو لاہور

" پیف " - لاھور

مکتبہ اُردو

کی تخلیقات اُردو ادب کے ذخیرے میں گراں بہا اضافہ اور پاکستان و ہندوستان کی ذہنی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں

پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھنے والوں اور جدید ادب کے بیباک علم برداروں کا واحد ترجمان

ادب لطیف